BY THE LATE REVD. MABOUS DODS, D. D.

Reprint from Masihi Tajalli, 1911.

یعنی

بائبل کس طرح پیدا ہوئی۔
اور اس کی خاصیت کیا ہے

جو

سکاٹلینڈ کے نامور پروفیسر ڈاڈز صاحب ڈی۔ ڈی کے اُن
مشہور لیکچروں سے تیار کی گئی ہے۔ جو صاحب موصوف نے امریکہ کے طلبا
کو دیئے تھے۔

پنجاب رلیجس بُک سوسائٹی

انارکلی لاہور

۱۹۱۱ ع

قیمت ۴؍ P. R. B. S. Lahore. *Reg. No.* 1555. اوّل (۱۰۰۰)

غلام قادر مسیحی پرنٹر لاہور کی معرفت
نولکشور پریس لاہور میں چھپی

یا یوں کہیں کہ جو باتیں دین اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں ان کی بابت
بڑھکر بائبل کچھ نہیں سکھاتی ہے

بائبل کس طرح پیدا ہوئی اور اسکی خاصیت کیا ہے

پہلا باب

بائبل اور دیگر متبرک کتابیں

محمدؐ صاحب نے قرآن میں مسیحیوں کو اہل کتاب کہا ہے۔ مگر یہ خطاب اُن کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ کیونکہ دُنیا میں کئی قومیں ایسی گزری ہیں جو اہل کتاب ہونے کا دعوےٰ کرتی تھیں اور اب بھی کئی موجود ہیں جو یہی دعوےٰ کرتی ہیں۔ محمدؐ صاحب کے نمودار ہونے سے پیشتر کئی مذاہب ہستی کی سٹیج پر سے نابود ہو چُکے تھے۔ مثلاً اہل مصر اور اہل بابل کے مذاہب مفقود ہو گئے تھے۔ مگر وہ سب اپنے اپنے وقت پر الہامی نوشتوں کے رکھنے کا دعوےٰ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح زوراستر۔ بُدھ۔ اور کنفوشس کے پیرو۔ اور نیز اہل ہنود اور اہل اسلام اہل کتاب ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں ۔

لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ زمانہ سلف میں جو اقوام تالیف و تصنیف کے فن میں گوے سبقت لے گئی تھیں اور جن کے علم ادب کی شہرت تمام دُنیا میں ہو رہی تھی وہی ایسی قومیں تھیں جنھوں نے اہل کتاب ہونے کا

[illegible] دعوےٰ نہیں کیا تھا۔ مثلاً اہل یونان کوئی لکھی،
وہ غائب کی باتیں یا تو خاص خاص مندروں میں جو [illegible] ب ذات پ
وسیلے دریافت کیا کرتے تھے۔ یا اُن کا پتہ مختلف نشانوں اور شگونوں سے لگایا کرتے تھے۔ وہ روایتیں جو ان کے دیوتاؤں سے متعلق تھیں۔ اور وہ اخلاقی تصوّرات اور اصول جو اُن کی زندگیوں کو مؤثر کیا کرتے تھے وہ ہومر جیسے شاعروں یا افلاطون جیسے فلاسفروں کی کتابوں میں قلمبند تھے۔ کچھ ایسا ہی حال اہل روم کا بھی تھا۔ وہ بھی کسی الہامی کتاب کے رکھنے کا دعوےٰ نہیں کیا کرتے تھے۔ مگر جب رومی قوم کے اندر مذہبی خیالات نے پیدا ہوکر یہ تقاضا شروع کیا کہ دینی ضروریات کو پُورا کرنا چاہیئے تو الہامی کتاب کی جگہ ستوئیقی فلسفہ اور منادی نے لے لی۔ ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ گو یونانی شعرا اور رومی فلاسفر الہام کا دعوےٰ نہیں کرتے تھے تاہم وہ وہ کچھ لکھ گئے جو آج یورپ کی مذہبی زندگی کا ایک بڑا جزو سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی کتابوں میں اخلاقی معاملات کے متعلق اور نیز اُس رشتہ کی نسبت جو انسان اور اندیکھی چیزوں کے درمیان پایا جاتا ہے بہت ایسی تعلیمات موجود ہیں جو اب بھی بڑے ذوق و شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ مگر ہم اُن کو الہامی نہیں کہہ سکتے۔

لیکن مشرقی مذاہب کو مقدس نوشتوں کا مخزن سمجھنا چاہیئے۔ چند سال کا عرصہ ہوا کہ قرآن کو چھوڑکر باقی سب مشرقی متبرک کتابیں مردہ یا نامعلوم زبانوں کے کواڑوں کے اندر قید تھیں۔ ژند۔ سنسکرت۔ سنہالی اور چینی زبانوں سے لوگ بالکل ناآشنا تھے۔ لیکن اس زمانہ میں ان کتابوں کے مضامین سے واقف ہونا آسان ہوگیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر میکس میولر کی جانفشانی اور عرقریزی کے سبب سے آج کل انگریزی زبان میں کم ازکم پچاس کتابیں ایسی تحریر ہوچکی ہیں جو مشرق کی مقدس کتابوں پر روشنی ڈالتی ہیں اور جن کے وسیلے سے ہم اُن کا مطالعہ باآسانی کرسکتے ہیں۔ اب یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ان کتابوں کو پڑھ کر بہت لوگ یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ ان میں اور بائبل میں کچھ فرق ہی نہیں۔

یا یوں کہیں کہ جو باتیں دین اور اخلاق کے متعلق ان کتابوں میں درج ہیں اُن سے بڑھکر بائبل کچھ نہیں سکھاتی ہے۔ اس غلط خیال کی تصحیح اور اصلاح کے لئے اُن الفاظ پر غور کرنا چاہیئے جو پروفیسر میکس میولر کے قلم سے نکلے ہیں اور جو اُس دیباچہ میں پائے جاتے ہیں جو پروفیسر موصوف نے ان کتابوں کے سلسلے کے شروع میں چھاپاں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "میں اقرار کرتا ہوں کہ سالہا سال تک یہ بات میرے لئے ایک معما سا تھی اور بہت درجہ تک اب بھی ہے کہ یہ کس طرح ہوا؟ کہ مشرقی کی متبرک کتابوں میں جہاں ایک طرف بہت سی باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو بالکل تازہ۔ نیچرل۔ سادہ۔ خوبصورت اور راست معلوم ہوتی ہیں وہاں اُن کے بالمقابل ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو نہ صرف سراسر مہمل۔ مصنوعی اور پُرحماقت ہی ہیں۔ بلکہ نہایت بھیانک اور نفرت انگیز بھی ہیں۔ ایک جگہ برہمناؤں کے بارے میں وہ یوں رقمطراز ہے "یہ کتابیں اس لائق ہیں کہ آدمی ان کا مطالعہ اُسی طرح کرے جس طرح حکیم کسی مخبوط الحواس کی بیہودہ گوئی اور دیوانوں کی بکواس کا مطالعہ کیا کرتا ہے۔ اہل فکر ان کتابوں کو ایک مُرجھائی ہوئی حشمت کا کھنڈر تصور کرتے ہیں یا ایک قسم کی بلند پروازی کی یادگار سمجھتے ہیں۔ پر جب ہم ان کتابوں کو (برہمناؤں کو) اپنی زبان (یعنی انگریزی) میں ترجمہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھکر حیرت آتی ہے کہ انسان نے اپنی زبان اور اپنے دماغ کو ایسی باتوں کے تحریر کرنے میں کس طرح صرف کیا"۔

واقعی اور کسی کتاب کے مطالعہ سے پڑھنے والا اس قدر نہیں تھکتا جس قدر ان متبرک کتابوں کو پڑھتے پڑھتے تھک جاتا ہے۔ کسی متبرک کتاب کو اُس کی اصل زبان میں تھوڑی دیر کے لئے طوطے کی طرح رٹنا اور اُسے باعث ثواب تصور کرنا اور بات ہے۔ مگر اُس کے ترجمے کو اپنے سامنے رکھنا اور اُسے ایسا دلچسپ پانا کہ اُس کی تلاوت سے جی کبھی نہ اُکتائے اور بات ہے۔ اہل تحقیق بڑی برداشت کے ساتھ ان کتابوں کے ترجموں کو پڑھتے ہیں اور اس غرض سے کہ اُن لوگوں کے دماغی قوے کا موازنہ کریں جو یہ مانتے ہیں کہ ان ہی کتابوں میں اعلےٰ درجے کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جو لوگ مسیحی مذہب کے نوشتوں

سے واقف ہیں اور زمانۂ حال کے خیالات سے مس رکھتے ہیں وہ ان کتابوں سے کسی طرح کا مذہبی جوش یا فائدہ بخش علم حاصل نہیں کرتے ہیں۔ باوجود اسکے ہمیں یہ کہنا بلکہ شکرگزاری کے ساتھ یہ اقرار کرنا چاہیئے کہ ان کتابوں میں بہت سی عمدہ اور اعلےٰ درجہ کی اخلاقی باتیں پائی جاتی ہیں۔ بالخصوص کنفیوشس اور بُدھ کی کتابوں میں۔ گو ہم ان کتابوں کو متبرک محض آداب تہذیب کے سبب سے کہتے ہیں کیونکہ دراصل وہی کتاب پاک یا متبرک یا مقدس یا الہامی کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے جو خدا اور روحانی حقائق کی قائل ہے۔ مگر کنفیوشس اور بُدھ کی کتابیں ذات باری کے متعلق خاموش ہیں۔ کنفیوشس تو اگناسٹک تھا۔ چنانچہ اُس کا مقولہ یہ تھا "ہر ایک شخص کو حق العباد کے متعلق اپنے فرائض ادا کرنے میں نہایت سرگرمی سے کام لینا چاہیئے اور رُوحانی ہستیوں سے کچھ واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے گو اُن کی تعظیم کرنا مناسب ہے"۔ یہ الفاظ اُسی کے ہیں اور اُس کی اصل حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ وہ نہ تو کھلے اور واضح الفاظ میں رُوحانی دُنیا کا اقرار کرتا ہے اور نہ صاف طور پر اُس کا انکار ہی کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا خیال یہ تھا کہ انسان کو اُن باتوں سے جو اس زمین سے علاقہ نہیں رکھتی ہیں کچھ سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔ پس کنفیوشس کی کتابوں میں مذہب نہیں پایا جاتا ہے کیونکہ مذہب جیسا ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں وہ راہ ہے جو ہمیں خدا تک پہنچاتی ہے لیکن مذکورہ بالا کتابوں میں خدا کے متعلق اور رُوحانی صداقتوں کے بارے میں ایک قسم کی خاموشی یا انکار نظر آتا ہے۔ تاہم اُن میں عجیب قسم کے خالص اخلاق کی تعلیم ملتی ہے۔ جب کنفیوشس کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد نے مختلف اصولوں اور قاعدوں سے تنگ آکر اُس سے دریافت کیا "کیا کوئی مختصر اصول یا قاعدہ ایسا بھی ہے جو تمام زندگی کے فرائض پر حاوی ہو کر عمر بھر کے لئے دستور العمل ہو سکے"؟ تو اُس نے اُسے یہ جواب دیا "کیا باہمی سلوک وہ بات نہیں ہے جو تم جاننا چاہتے ہو؟ جو کچھ تم نہیں چاہتے کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں تم اُن کے ساتھ نہ کرو"۔ اب یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ بات اتفاق سے اُس کے

مُنہ سے نکل گئی۔ کیونکہ یہ وہ خیال ہے جو اُس کی تمام تعلیم میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر آتا ہے۔ اسی خیال کو اُس نے کچھ عرصہ کے بعد اس قابل یاد جملہ میں ادا کیا جس سے بڑھکر کوئی پُر مطلب جملہ مغربی فلسفہ نے پیش نہیں کیا۔ "(اوروں کو فائدہ پہنچانا ہی انسانیت ہے)"۔ اُس کے ایک ہم عصر فلاسفر نے اسی خیال کو لیا اور اُس پر ایک مطوّل رسالہ علم الاخلاق پر رقم کیا اور اُس میں اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ایک عالمگیر اور باہمی محبت تمام محامد و محاسن کی جڑ اور ہر طرح کی بدی کا علاج ہے۔

اسی طرح بُدّھ کی کتابوں میں بھی بہت عمدہ اخلاقی باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً جس طرح اُس نے نیک چلنی اور محبت کو ظاہری رسمیات پر ترجیح دی ہے ویسی صفائی اور زور سے اور کسی شخص نے ترجیح نہیں دی ہے۔ جس طرح اُس نے خود رائی خود بینی خود ستائی اور خود پسندی کی بیخ کنی اپنے شاگردوں سے طلب کی ہے اُس طرح شاذ ہی کسی اَور نے کی ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے "ہر شخص کو بدی پر نیکی سے غالب آنا چاہئے۔ لالچی آدمی پر فیّاضی سے غلبہ پاؤ۔ جھوٹے کو سچّائی سے مغلوب کرو۔ کیونکہ نفرت کا خاتمہ نفرت سے نہیں ہوتا۔ نفرت محبت سے معدوم ہوتی ہے"۔ ہاں بُدھ کے نوشتوں میں سے ہم بآسانی ایسے اصول و قواعد جمع کر سکتے ہیں جو انسانی زندگی پر ایک دیرپا اثر پیدا کرتے ہیں۔ ہم اُن سے آداب اخلاق یا محاسن اخلاق کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کر سکتے ہیں جو راستبازی کی راہ دکھانے میں عمدہ ہادی کا کام دیتا ہے۔ مگر با ایں ہمہ بُدھ مت نے بہت ہی کم درجہ تک سوسائٹی کو پاک صاف کیا۔

بُدھ مت کی ناکامی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ ہستیِ خدا کا منکر ہے اور آئندہ زندگی کا بھی انکار کرتا ہے پس بُدھ مذہب نا امیدی کا مذہب ہے اور اُس کی نا امیدی کی جڑ اُس کا دہریہ پن ہے۔ بُدھ انسان کی زندگی کو بالکل خالی اور غم سے معمور اور خرابی کا مضغہ تصوّر کرتا تھا۔ پس اُس کے نزدیک نجات کا اصل طریق یہ تھا کہ انسان زندگی سے علیحدہ ہو جائے۔ ہر طرح کی خواہش کو مغلوب کرنا گویا زندگی پر

غالب آتا تھا۔ اور سب سے کامل فتح یہ سمجھی گئی کہ انسان نِروان حاصل کرے یعنی اُس حالت کو پہنچ جائے جہاں نہ کسی طرح کا جذبہ محسوس ہو اور نہ زندگی یا کسی قسم کی حرکت باقی رہے اب بدھ اس نیستی کا کبھی قائل نہ ہوتا اگر وہ خدا کی ہستی اور حیات پر ایمان لاتا۔ اِنسان کے اندر راستبازی کے اشتیاق سے ہزارہا درجہ گہرا شوق خدا کے وصل کا پایا جاتا ہے پس اگر خدا نہ ہو اور نہ وہ اُمید ہو جو خدا کی حضوری اور صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ تو مورلیٹی (تہذیب اخلاق) تنہا کبھی بنی آدم کے دلوں میں قائم نہیں رہ سکتی۔ پس بدھ کا مذہب صفحات تاریخ پر نہایت جلی حروف میں ہمارے لئے یہی نصیحت رقم کرتا ہے کہ خدا کے بغیر نہ نیک چلنی اور نہ راستی قائم رہ سکتی ہے ٭

واضح ہو کہ اگر ہم صرف یہی مانتے ہیں کہ بائبل اور دیگر متبرک کتابوں میں جو فرق ہے پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ بائبل کی اخلاقی تعلیم اُن کتابوں کی اخلاقی تعلیم سے افضل ہے اور بس۔ تو ہم یاد رکھیں کہ جب ہم پر یہ بات ظاہر ہو جائیگی کہ دوسری کتابوں میں بھی بہت سے اعلےٰ اخلاقی اصول پائے جاتے ہیں تو ہم نہایت مغموم و مایوس ہو جائینگے اور واقعی بہت لوگوں کا بعینہ یہی حال ہوتا ہے۔ بجاے اس کے کہ وہ یہ دیکھکر خوش ہوں کہ جیسا ہمارا خیال تھا اُس سے کہیں زیادہ بنی آدم نے راستی اور پاکیزگی کی خوبی کو دیکھا اور محسوس کیا ہے وہ اُلٹا جل مرتے ہیں۔ اگر انسان اپنے جسم کی اناٹومی (تشریح) سے واقف ہو کر اُس کی صحت اور شفا کے علاج کی صورتیں تجویز کر سکتا ہے تو وہ بہت درجہ تک یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنی روحانی کمزوریوں کا پتہ لگائے اپنی روحانی ضروریات کو محسوس کرے اور اُن کی مرافعت کی تجویزیں سوچے۔ پس اگر ہم کسی کتاب میں جو متبرک ہونے کا دعوےٰ کرتی ہے اچھی اور عمدہ اخلاقی باتیں دیکھیں تو ہم یہ نہ سمجھیں کہ اُن کی اچھائی اور عمدگی کو مان لینے سے بائبل کی فضیلت جاتی رہیگی۔ نہیں۔ اس سے بائبل کی فضیلت دُور نہیں ہوگی۔ کیونکہ بائبل کی فضیلت محض اخلاقی تعلیم کی خوبی پر مبنی نہیں ہے گو اس میں شک نہیں کہ بائبل کی اخلاقی تعلیم کامل اور بےنقص ہے۔ ہم اِس بات پر بحث نہ کریں کیونکہ اس بات پر بحث کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی چھوٹی سی بات کے فتح کرنے کے واسطے اپنے سارے سامان جنگ کو صرف کرنا ہے

بائبل کی فضیلت اس بات میں ہے کہ ہم اُس میں خدا کی محبت اور راستی کا مکاشفہ ایک شخص میں پاتے ہیں اور نیز اُس کے وسیلے سے خدا کا سچا عرفان ہمکو نصیب ہوتا ہے۔ اور وہ رشتے جو اُلجھے ہوئے تھے اُس علم کے وسیلے جو ہم ذات باری کے متعلق اس کتاب کی معرفت حاصل کرتے ہیں سلجھ جاتے ہیں یعنی خدا ہمارا باپ اور انسان ہمارا بھائی بن جاتا ہے۔ خدا کی ربوبیت کا رشتہ اور انسان کی اُخوت کا رشتہ پھر بحال ہو جاتا ہے۔ یہ باتیں ہیں جن کے سبب سے بائبل اور کتابوں پر فضیلت رکھتی ہے۔ اور جہاں یہ باتیں موجود ہونگی وہاں چال وچلن اور اخلاق کی درستی آپ ہی آپ پیدا ہو جائیگی ؛

یہاں تک تو ہم نے صرف اُن کتابوں کا ذکر کیا ہے جو محض انسان کے اخلاق اور چال وچلن کی اصلاح کا بیڑا اُٹھاتی ہیں۔ مگر ان کے علاوہ اَور کتابیں بھی ہیں جو اس سے زیادہ کا دعوےٰ کرتی ہیں۔ یعنی اُنہی بگڑے ہوئے رشتوں کو جن کی طرف اُوپر اشارہ ہوا اصلاح پر لانے کا دم بھرتی ہیں۔ مگر عام طور پر اُن میں سے کئی ایک کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن میں یہ قباحت پائی جاتی ہے کہ وہ اُس وقت تحریر کی گئیں جب لوگ ظاہری رسوم کو مذہب کا اعلےٰ حصّہ تصور کرتے تھے۔ پس جس مذہب کا نقشہ ان کتابوں میں پایا جاتا ہے وہ اُن لوگوں کے لئے جو مسیحی تعلیم کے وسیلے مذہب کو باطنی اور روحانی حقیقت سمجھنے لگ گئے ہیں دلکش پسندیدہ نہیں ٹھیر سکتا۔ ایک ایک قدم پر ایسی ریتیں ایسی رسمیں مشاہدے سے گزرتی ہیں کہ ناگفتہ بہ۔ خاص خاص لفظوں کے دہرانے میں ایسی تاثیر یا جادو تصور کیا جاتا ہے جسے کوئی روشن ضمیر قبول نہیں کر سکتا۔ اور اسی قسم کی اور بہت سی ناقص اور نامرغوب باتیں بھی معائنہ سے گزرتی ہیں جن کے سبب سے یہ کتابیں جو ریت ورسم پر زور دیتی ہیں روحانی مزاج اشخاص پر کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتی ہیں ؛

قرآن سے اچھی باتوں کی توقع کی جاسکتی تھی کیونکہ وہ تو نئے عہد نامے سے قریباً چھ سو سال بعد تحریر ہوا تھا۔ مگر اُس میں بھی ہمارے لئے چنداں دلچسپی نہیں پائی جاتی۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اوّل تو وہ فقط ایک ہی آدمی کی تصنیف

ہے اور پھر وہ ایک آدمی بھی ایسا آدمی تھا جو صرف ایک ہی بات پر زور دیا کرتا تھا۔
اور وہ بات یہ تھی کہ خدا دُنیا کا حاکم ہے اور ہمیں اُس کی تابعداری کرنا چاہیئے۔
اب کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ تعلیم درست نہیں ہے یا کہ اس پر زور دینا درست نہیں
ہے۔ بات غور طلب یہ ہے کہ بائبل میں خدا کی محبت۔ عدل۔ پاکیزگی اور دیگر
صفات کی کامل تصویر سامنے آتی ہے۔ ماسوائے اس کے قرآن میں جابجا کلام
کی نرمی کی بجائے ایک قسم کی سختی پائی جاتی ہے۔ قرآنی آیات پر جو لوگ ایمان
نہیں لاتے اُن کو یہ دھمکی دی جاتی ہے۔ یقیناً وہ جو ہماری آیتوں کو نہیں مانتے
ہم اُنہیں آگ سے جلائینگے۔ اور جب اُن کے چمڑے خوب جل چکینگے تو ہم نئے
چمڑے پیدا کر دینگے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔ اور پھر یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ
آنحضرت نے آخرکار ایسے مکاشفے تیار کرنا شروع کر دئے جو آپ کے منشا کے
مطابق اور آپ کی اغراض کی انجام وہی کے لئے خوب موزوں تھے ۔

مگر قرآن میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ وہ ایک قسم کا رسمی اور شرعی
مذہب پیش کرتا ہے۔ اُس میں خدا کی محبت اور فضل کا وہ کشف نظر نہیں آتا جو
نئے عہدنامہ کے صفحوں کو اپنی تجلّی سے روشن کر رہا ہے۔ برعکس اس کے ہم
یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن رسمی یا شرعی فرائض پیش کرتا ہے اور اُن کی تکمیل کے لئے
دھمکیوں اور وعدوں سے کام لیتا ہے۔ واضح ہو کہ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ
دھمکی یا وعدہ کے لئے کلام الٰہی میں جگہ ہی نہیں ہے اور نہ ہمارا یہ ہی مطلب ہے
کہ فرائض کا اظہار الہامی کلام کے شایاں نہیں ہوتا۔ بائبل میں یہ سب باتیں
کم و بیش پائی جاتی ہیں تاہم اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جب ہم بائبل کو شروع
سے پڑھتے ہوئے خاتمہ کی طرف بڑھتے ہیں تو یہ بات مشاہدہ سے گزرتی ہے
کہ جس قدر الہام بندوں کی حالت اور ضرورت کے مطابق ترقی کرتا جاتا ہے اُسی قدر
کلام کے حرف پر زور کم اور روح پر زیادہ دیا جاتا ہے۔ ظاہری اور رسمی شریعت کے
عوض روحانیت زیادہ واضح اور مکمل ہوتی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسی
خیال کو یوں ادا کر سکتے ہیں کہ قرآن زیادہ تر چال وچلن پر زور دیتا ہے بخصلت

یا سیرت پر اتنا زور نہیں دیتا۔ انجیل برعکس اس کے چال وچلن کو سچی سیرت کا پھل تصور کرتی ہے۔ لہذا اس قدر ظاہری فرضوں اور رسموں کے اوپر اتنا زور نہیں دیتی جتنا اُن اصولوں اور صداقتوں کو پیش کرتی ہے جن کے وسیلے گرے ہوئے انسان کو نئی پیدائش اور نئی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اور ہر منصف مزاج شخص کو یہ بات تسلیم کرنی پڑیگی۔ کہ جو مذہب ہماری طبیعت اور مزاج کو بدلنے کی تجویز پیش نہیں کرتا اور ایسی روح ہمارے اندر پھونکنے کا دم نہیں بھرتا جو اپنے آپ کو راستبازی کی صورت میں خودبخود ظاہر کرے وہ کامل مذہب نہیں ہے۔ پس ترقیٔ تہذیب کی کسی خاص منزل پر محمدی مذہب نے بنی آدم کو مدد دی ہو تو ہو اور اگر ویسی ہی منزل پھر کسی جگہ سامنے آئے تو شائد وہی مدد پھر وے جو پہلے دی تھی۔ مگر اُن لوگوں کے لئے جو مسیحی مذہب کو سمجھتے ہیں محمدی مذہب میں کسی طرح کی مدد نہیں پائی جاتی بجز اس کے کہ وہ اعلیٰ منزل کو چھوڑ کر دین کی ابجد کو پھر شروع کریں۔ پس محمدی مذہب مسیحی مذہب کے سامنے دو ہزار برس سے زیادہ پُرانا معلوم ہوتا ہے۔

جو فرق بائبل اور دیگر مقدس کتابوں میں پایا جاتا ہے وہ اُس وقت زیادہ سمجھ میں آتا ہے جب ہم بائبل کی اصل خاصیت اور ماہیت پر غور کرتے ہیں۔ اور اسی بات کی طرف ہم اس وقت متوجہ ہونگے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہم بائبل کھول کر سلسلۂ تحقیق شروع کرتے ہیں تو کئی ابتدائی سوالات برپا ہوتے ہیں جن کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس موقع پر ہم ان سوالات پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے تاہم ایک دو کی طرف اشارہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اوّل یہ سوال کیا جاسکتا ہے اور اُن لوگوں کی طرف سے جو مذہب کی روحانیت کے اس قدر قائل ہیں کہ حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں یہ سوال کیا بھی جاتا ہے کہ کتب ربّانی کا ایک متبرک اور مستند لکھا ہوا مجموعہ ایک ایسے مذہب کا جو سراسر روحانی ہو جائز اور ضروری جزو سمجھا جا سکتا ہے؟ پُرانے عہد کے لئے ایک لکھے ہوئے مجموعہ کا ہونا لازمی امر تھا۔ مگر نئے عہد کے درمیانی نے کوئی ایسا حکم یا اشارہ نہیں کیا جس سے ظاہر ہو کہ نئے عہد کی شرائط کا کسی تحریری دستاویز میں قلمبند کیا جانا ضروری امر ہے۔ پس یہ

کہا جاسکتا ہے کہ یہ زیبا نہیں کہ روحانی مذہب ایک لکھے ہوئے ظاہری قانون کا
پابند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو کوئیکر یا سوسائٹی آف فرنڈز کے نام سے مشہور
ہیں یہ کہتے ہیں کہ چونکہ نوشتے خود چشمہ نہیں ہیں بلکہ چشمے کا محض ایک مظہر ہیں لہذا
واجب نہیں کہ ہم انہیں صداقت اور عرفان کی سب سے اعلےٰ بنا تصور کریں اور نہ
پورے پورے طور پر ہم اُسے ایمان اور چلن کا قانون قرار دے سکتے ہیں"۔ مطلب
اس کا یہ ہے کہ نوشتے دوسرے درجہ کا قانون ہیں یا یوں کہیں کہ وہ روح سے
دوسرے درجہ پر ہیں۔ اسی طرح روم کی کلیسیا بھی اوّل جگہ اُس روح کو دیتی ہے جو
اُس کے وسیلے سے بولتی ہے جو اس زمین پر مسیح کا نائب قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی
پوپ کے وسیلے سے۔ واضح ہو کہ سوسائٹی اور فرنڈز بھی اور روم کی کلیسیا بھی اس
خصوص ہیں اُس صدا کی ایک گونج ہے جو ہر مسیحی دل سے برآمد ہوتی ہے اور وہ
یہ کہ کلیسیا کو مجموعۃً اور ہر شخص کو فرداً فرداً زندہ خداوند کی رہنمائی سے بہرہ ور ہونا
لہذا روشنی اور جوش کے لئے فقط پہلی صدی کی طرف نہیں دیکھنا چاہئے۔ اور ا
ہیں شک نہیں کہ اگر بائبل اس صدا کو جو زندہ خدا کی رہنمائی کے لئے ہمارے د
سے پیدا ہوتی ہے خاموش کرتی ہے اور ہمیں مسیح کی روح کی موجودہ اور پُراثر شخ
پر تکیہ کرنے سے ہٹاتی اور محض لکھے ہوئے حرف پر بھروسہ کرنے کی ترغیب دیتی۔
تو وہ ہمیں بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتی ہے ٭

ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ اگر بائبل کا یہ مقتضٰے ہے کہ پڑھنے والا اُس ہدا
اور رہنمائی کے متعلق جو مسیح کی زندہ روح کی موجودہ تاثیروں کے وسیلے نصیب ہوتا
ہے سُست اعتقاد ہو جاے اور محض بائبل کے حرف پر تکیہ کرے تو اس سے
بہت بھاری رُوحانی نقصان ہوگا۔ مگر باوجود اس اعتقاد کے کہ خدا اپنی روح کے
وسیلے اپنے بندوں کی ہدایت کرتا ہے خدا کے لکھے ہوئے کلام اور اُس کی زندہ رو
کے کام میں کسی طرح کی نامطابقت یا نامناسبت نہیں پائی جاتی ہے۔ اناجیل میں
ہمیشہ کے لئے ایک مرتبہ مسیح کی تصویر کھینچی گئی ہے اور اسی طرح رسولوں کے خطوط
میں ہمیشہ کے لئے ایک مرتبہ اُس رشتہ کا نقشہ جو انسان کی روح مسیح کے ساتھ رکھتی ہے

اُتارا گیا ہے۔ اور یہی وہ وسائل ہیں جنہیں روح پاک کام میں لاتی اور جن کی وساطت
سے بنی آدم کو مسیح کی رفاقت سے مشرف کرتی اور اُس روشنی سے بھر دیتی ہے
جو ہمیشہ اُس کے سچے علم کے ساتھ آتی ہے۔ خدا کی زندہ روح مسیح کی روح ہے۔
لیکن جب یہ سوال برپا ہوتا ہے کہ بائیبل کیا ہے تو اس کے ساتھ اس مسئلے
کی تحقیق کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ بائیبل کس طرح پیدا ہوئی؟ یا یوں کہو
کہ کس طرح اُس نے موجودہ صورت اختیار کی؟ مختلف کتابیں جو اُس میں درج ہیں
کیونکر لکھی گئیں؟

جب ہم اس تحقیق کی سلسلہ جنبانی شروع کرتے ہیں تو پہلی بات جو ہماری نظر
سے گزرتی ہے یہ ہے کہ اس کتاب میں فقط ایک ہی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ کئی
کتابیں شامل ہیں۔ ۳۹ پرانے عہدنامہ میں اور ۲۷ نئے عہدنامہ میں پائی جاتی
ہیں۔ لفظ بائیبل یونانی لفظ ہے۔ جو پہلے یونانی سے لاطینی میں اور پھر لاطینی سے
انگریزی میں استعمال ہونے لگا۔ اس کی لاطینی صورت ببلیا تھی جس کا تلفظ وہی
جو یونانی لفظ کا تھا۔ مگر لفظ خود لاطینی حروف کے پیرایہ میں نظر آنے لگا۔ یونانی
صورت Τα βιβλια تھی۔ جو جمع کا صیغہ ہے مگر واحد کے
طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی لئے انگریزی زبان میں واحد معنوں کے
ساتھ داخل ہوا۔ یونانی لفظ Το βιβλιον یا ἡ βιβλος
(یعنی کتاب) کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس چیز پر اُن دنوں کتابیں لکھی جاتی تھیں
Papyrus یا Byblus کہلاتی تھی۔ یہ مصری
سرکنڈا تھا جس سے ابتدا میں کاغذ بنایا گیا۔ اسی لئے قدیم زمانہ میں یہودی اپنی
متبرک اور مقدس کتابوں کو αἱ βιβλοι یا Τα βιβλια
کہنے لگ گئے۔ شروع میں تو کوئی نہ کوئی کلمہ صفت برائے تخصیص اس لفظ
کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا۔ مثلاً ان کتابوں کو "مقدس" کتابیں کہا کرتے
تھے۔ پھر اُن کو وزڈم آف سرخ کے دیباچہ میں "توراۃ اور انبیا اور دیگر موروثی
کتابیں" کہا ہے۔ اس سارے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ صیغہ جمع کے استعمال

نے اس خیال کو مدت تک تر و تازہ رکھا کہ اس مجموعہ میں محض ایک ہی کتاب نہیں پائی جاتی بلکہ ایک سے زیادہ کتابیں درج ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ تمام صفتی کلمات جو اس مجموعۂ کتب کے ساتھ استعمال کئے جاتے تھے ساقط ہو گئے اور لفظ بائبل بصورت واحد استعمال ہونے لگا۔ تاہم قدیم آبا اور متوسطین نے اس خیال کو کبھی نظر انداز نہیں کیا کہ اس کتاب میں بہت سی کتابیں پائی جاتی ہیں چنانچہ وہ اکثر اسے "الٰہی کتب خانہ" کہا کرتے تھے ؂

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا رشتہ ہے جو ان مختلف کتابوں کو ایک کتاب بناتا ہے وہ کونسی صفت ہے جسے ہم وہ مابہ الامتیاز قرار دیں جس سبب سے یہ ساری کتابیں دیگر سب کتابوں سے تمیز کی جائیں۔ اور جس سبب سے وہ آپس میں ایک ہی کتاب کے متفرق اجزا سمجھی جائیں۔ گو یہ کتابیں وقت تصنیف اور طرز عبارت اور مصنفوں کے خواص و صفات کے اعتبار سے ایک دوسری سے بہت فرق رکھتی ہیں۔ تاہم یہ ضروری امر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی عنصر ان کے درمیان ایسا عام اور مشترک ہو جو تمام فرقوں پر غالب ہو اور جس کی وجہ سے یہ کتابیں ایک ہی کتاب سمجھی جائیں۔ اس مجموعہ میں وہ دھندلی سی روائتیں ملتی ہیں جو تواریخی زمانہ کے ماقبل زمانوں سے علاقہ رکھتی ہیں۔ وہ تاریخی باتیں نظر سے گزرتی ہیں جو ایسے نوشتوں پر مبنی تصور کی جاتی ہیں جن کا سراغ اب صفحۂ ہستی پر کہیں نہیں ملتا۔ وہ نسب نامہ مشاہدہ میں آتے ہیں جو مابعد کی پشتوں کو نسل آدم کے قدیم آبا کے ساتھ مربوط کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ ایسے سوانح عمری معائنہ سے گزرتے ہیں جن کے سبب وہ بہادر جن کی زندگیوں میں یہ سوانح سرزد ہوئے ایسے غیر فانی ہو گئے ہیں پیتل اور پتھر کی یادگاروں کو وہ بقا حاصل نہیں جو انہیں حاصل ہے۔ اس مجموعہ میں فتح اور محبت کی غزلیں اور اُن لوگوں کے نوحے جو ہر طرح کی مصیبت اور الم میں مبتلا ہوئے اور وہ مزامیر جن کے الفاظ میں ہر زمانہ حمد باری کا ترانہ یا توبہ نالہ یا ذات باری کے شوق وصال کا پُرجوش اظہار کر سکتا ہے پائے جاتے ہیں۔

اس میں دُنیوی حکمت کے امثال اور انبیا کے وہ الہامی اقوال موجود ہیں جو کسی جگہ تنبیہ کسی جگہ سزا اور کسی جگہ حوصلہ افزا باتوں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ اس میں انجیل کا سادہ سا بیان۔ کلیسیا کے قدیم تواریخی حالات اور وہ خطوط درج ہیں جو کلیسیا کے بانیوں کی طرف سے نصیحت اور محبت کی راہ سے کلیسیاؤں کی جانب ارسال کئے گئے اگر صرف یہ غرض مدنظر ہوتی کہ ہمارے سامنے یہودیوں کے علم ادب کی وہ مختلف صورتیں پیش کی جائیں جو اُس نے اُس سارے عرصہ میں اختیار کیں جو اس قوم نے اپنے ملک میں کاٹا تو ہماری رائے میں علم ادب کی اس سے زیادہ بوقلموں شاخیں ہمارے سامنے نہیں لائی جا سکتی تھیں۔ اگر ہم ایک ہی جلد میں ناکس صاحب کی "تاریخ ریفارمیشن" اور بنین صاحب کا "مسیحی مسافر" اور "سیوا انرولا کے سرمن" اور "سیموئیل جانسن کے اقوال" اور "کوپر کے خطوط" اور "شیکسپیئر کا ہیملٹ" مدوّن کریں تو یہ مجموعہ بھی عبارت اور شکل اور دیگر خصائص میں ایسا بوقلموں نہیں ہوگا جیسا کہ وہ مجموعہ ہے جو بائیبل میں مجلّد ہے ؛

مگر باوجود ان تفرقات کے اس کتاب کا ایک ہونا روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی خاص حصہ یا ٹکڑے کی نسبت یہ کہے کہ وہ کل کے ساتھ پوری پوری مطابقت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کہ کوئی غزل الغزلات یا واعظ کی کتاب یا دوسرے پطرس پر کچھ اعتراض کرے۔ مگر جب ہم کل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی یکتائی اور یکجہتی میں کسی طرح کی چون و چرا کو جگہ نہیں۔ اس کے ایک ہونے کو سب نے تسلیم کر لیا ہے ؛

یہاں ایک بات یاد رکھنے کے قابل معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ یکتائی وحدت (Unity) جو بائیبل کی مختلف کتابوں میں نظر آتی ہے قصدی نہیں ہے اور نہ مصنوعی ہی ہے۔ لکھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ گویا وہ اجزاء ہیں جن کی تدوین سے ایک کل پیدا ہوگا اور نہ اُن کا یہ ارادہ ہی تھا کہ ایسا ہو مثلاً جب مزامیر کے مصنفوں نے اپنے گناہ کے اقرارات کو یا اُن جذبات کو جو عشق الٰہی کے متعلق اُن کے دل میں پیدا ہوتے

کاغذ کے حوالے کیا تو انہیں یہ ہرگز ہرگز معلوم نہ تھا کہ وہ ایک غیر فانی لٹریچر پیدا کر رہے ہیں جب واعظ کے مصنّف نے اپنی کتاب کو ختم کر کے اپنے قلم کو میز پر رکھا اُس وقت اُس کی مطلق یہ آرزو نہ تھی کہ اس کتاب کو ایسے بے نظیر مجموعہ میں جگہ ملے۔ اور جب پولوس ایشیائے کوچک کی کلیسیاؤں کے پاس کسی آتے جاتے کے ہاتھ دوستانہ خط بھیجا کرتا تھا تو اُسے بالکل یہ خیال نہ تھا کہ دو ہزار برس کے بعد میری باتیں مبرّاعن الخطا سمجھی جائینگی۔ تاہم جب ان مختلف مصنّفوں کی کتابیں ایک جلد میں جمع ہو کر مشاہدہ سے گزرتی ہیں تو اُن کی وحدت میں کسی طرح کا احتمال نہیں رہتا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ وحدت یہ یکتائی کس بات میں پائی جاتی ہے ؟

بادی النظر میں یہ خیال گزرتا ہے کہ نوشتوں کی یہ وحدت شائد اس بات میں پائی جاتی ہے کہ بائیبل میں ایک قوم کا تمام علم ادب جمع ہے۔ لیکن یہ خیال محض سطحی سا ہے۔ لہذا قبول کرنے کے لائق نہیں۔ اوّل یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض علما کی رائے کے مطابق قدیم مصنّفوں نے ایسے نوشتے استعمال کئے جو کبھی اس مقدس مجموعہ میں داخل ہی نہیں ہوئے۔ دوم مابعد کے مصنّفوں میں سے کئی ایک کے معاصرین کی کتابیں جو اب بالکل مفقود ہو گئی ہیں یا بعض کے بعض حصّہ اب تک موجود ہیں کبھی اس مجموعہ میں داخل نہیں کی گئیں۔ فیلو نے کئی کتابیں لکھیں۔ جو دینی خیالات سے پُر تھیں سب اُنہیں پڑھتے تھے۔ وہ اخلاقی خیالات و تاثیرات کے اعتبار سے لاثانی سمجھی جاتی تھیں۔ تاہم کبھی کسی کے خیال میں یہ بات نہیں آئی کہ اُنہیں بائیبل میں داخل کرے۔ اسی طرح جوسیفس کی کتابوں کا حال ہے۔ اب جو بات پُرانے عہدنامہ پر صادق آتی ہے وہ نئے عہدنامہ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ پس ہماری بائیبل کی تدوین اس آسان طریق پر نہیں ہوئی کہ یہودی قوم کا علم ادب ایک جلد میں جمع کیا جائے

پھر شائد یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ جو عنصر بالاشتراک ان کتابوں میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اُن میں خدائے تعالےٰ کا خیال برابر پایا جاتا ہے۔ گو یہ خیال صحیح ہے کہ بائیبل کے شروع سے آخر تک ایک قسم کی دیندارانہ جھلک اپنا جلوہ دکھاتی ہے تاہم یہ خصوصیت بھی ان بے شمار کتابوں کی یکتائی اور وحدت کا باعث نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گو صحائف بائیبل میں طرح طرح کے مضامین پر بحث پائی جاتی ہے
تاہم سب مصنفوں کے سامنے ایک ہی نشان موجود ہے - ایک ہی قسم کا خیال اُنکے
دل میں جاگزین ہے - خواہ ہم کوئی زبور پڑھیں - خواہ کسی بہادر کی مردانگی اور شجاعت
کے دل چلے کاموں پر نظر ڈالیں - خواہ نکتہ چینوں کی نکتہ چینیوں کا موازنہ کریں خواہ
پولیٹکل انقلابوں کی نبوتوں یا بادشاہوں کے تاریخی بیانوں پر دھیان لگائیں - بہر حال
یہ بات دیکھنے میں آئیگی کہ ایک ہی خدا کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے - اسی کے لئے
وفاداری اور جاں نثاری طلب کی جاتی ہے - اسی سے یہ اُمید رکھی جاتی ہے کہ وہ ایک دن
راستی سے دُنیا کا انصاف کریگا - مضامین مختلف ہوں تو ہوں کتابوں کی تصنیف کے اوقات مختلف
ہوں تو ہوں - مصنفوں کے حالات مختلف ہوں تو ہوں مگر اس قسم کے تخالف اور تباین کے بیچوں بیچ
سے ایک ہی اعتقاد کا رشتہ گذرتا ہے - آفرینش کائنات کا حال اگر بیان کیا گیا ہے
تو سائنس کی صورت میں نہیں کیا گیا ہے - بلکہ مذہب کے پیرایہ میں - یہودیوں کے
کارنامے اگر قلمبند کئے گئے ہیں تو اس لئے نہیں کہ اُس قوم کی حشمت اور بزرگی
دوبالا ہو - بلکہ اس لئے کہ خدا کا جلال ظاہر ہو - یہودی بادشاہت کا حال سلک
تحریر میں منسلک کیا جاتا ہے نہ اس لئے کہ وہ عام دُنیوی تاریخ کے طور پر سمجھا جائے
بلکہ اس لئے کہ وہ اس بات کی مثال ٹھہرے کہ خدا نے کس طرح اپنے لوگوں کی تربیت
کی - نبی آتے ہیں اور ملکی معاملات میں دخل دیتے ہیں - پر محض اس واسطے کہ وہ اس
بات پر گواہی دیں کہ تاریخ کے ہر مشکل موقع پر نہ صرف انسانی طاقتیں کام کرتی ہیں بلکہ
ایک الٰہی شخص بھی ہے جو کام کرتا ہے - الحاصل یہ کتابیں واقعی مذہبی کتابیں ہیں -
لاریب مقدس ہیں کیونکہ ان میں اول سے آخر تک خدائے تعالےٰ کا ذکر پایا جاتا ہے۔

یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ سب لوگ مانتے ہیں کہ بائیبل میں خدا کی شناخت
اعلےٰ درجے تک پائی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے بیانات میں ایک قسم کی
عظمت اور بلندی محسوس ہوتی ہے - اس بات پر گواہی اُن سب لوگوں سے ملتی
ہے جو نہ تو بائیبل کے طرفدار ہیں اور نہ اُس کے برخلاف کسی طرح کا تعصب ہی
رکھتے ہیں - اہل مغرب میں سے کارلائل - امرسن - رسکن - ایوالڈ - کولرج -

سروالٹر سکاٹ اور دیگر علما کی شہادت قابل لحاظ ہے۔ اب اگر یہ بات سچ ہے جیسا کہ بے شمار اشخاص نے شہادت دی ہے کہ بائیبل نے دنیا میں اعلےٰ زندگی کو ہر جگہ تقویت دی ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ اُس نے لوگوں کے دلوں میں افضل قسم کے تصورات پیدا کئے ہیں اور انہیں سیرت کے اعلےٰ زینے تک پہنچایا ہے۔ اگر اُس نے ہر پشت میں قوموں کو ترقی بخشی اور اچھی سے اچھی تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو موت کے وقت دلیری اور تسلی بخشتی ہے۔ اگر اُس نے فی الواقع آسمان کو زمین کے نزدیک لا کھڑا کیا ہے۔ اگر وہ خدا کو ہم پر بطور پیارے باپ کے ظاہر کرتی اور نا اُمیدوں اور شکستہ دلوں اور خستہ حالوں کو تسلی اور اطمینان اور اُمید سے بھر دیتی ہے تو اُس میں فی نفسہ وہ خاصیت موجود ہے جو اُسے خدا کا کلام یا پیغام ثابت کرتی ہے +

لیکن یہ صفت بھی وہ رشتہ نہیں ہے جو ان کتابوں کو ایک کتاب بناتا ہے کیونکہ اَور بہت سی ایسی کتابیں ہیں جن میں یہی خاصیت پائی جاتی ہے۔ خدا ہمارے ساتھ اور وسیلوں کے ذریعے سے بھی کلام کرتا ہے۔ فطرت تاریخ انتظام پروردگاری اور ضمیر وہ وسائل ہیں جن کی وساطت سے وہ ہم سے ہمکلام ہوتا ہے وہ ہر روز ہمارے ساتھ نیک لوگوں اور اخلاقی کتابوں اور خصوصاً ہمارے ہی تجربوں کے وسیلے نہایت واضح اور صاف طور پر باتیں کرتا ہے۔ کئی ایک خداتعالےٰ کی حضوری کا پہلا احساس کسی دوست کے نمونہ یا نصیحت کے وسیلے یا کسی عبرتناک سانحہ کو دیکھکر حاصل کرتے ہیں۔ اور وہ باتیں جو تجربہ سے پیدا ہوتی ہیں بارہا نوشتوں کی نسبت زیادہ تاثیر اور صراحت کے ساتھ ہمارے دل پر جم جاتی ہیں۔ پس خدا کا ہر طرح کا کلام الہامی نوشتہ نہیں سمجھا جا سکتا +

تاہم خدا کے دیگر اقسام کے کلام کے درمیان بائیبل کے نوشتے ایک خاص قسم کی ممتاز اور با اختیار جگہ رکھتے ہیں۔ پس وہ کیا چیز ہے جس کے سبب سے ہم بائیبل کو بالتخصیص خدا کا کلام کہتے ہیں؟ جب ہم یہ مانتے ہیں کہ نیک لوگوں کی زندگیوں اور کتابوں میں سے وہی روح بولتی ہے جو بائیبل میں بولتی ہے

تو وہ کیا مابہ الامتیاز ہے۔ وہ کیا معیار ہے جس کی وجہ سے ہم بائبل کے نوشتوں کو اُن سے الگ کرتے اور اُن پر ترجیح دیتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اُن کتابوں میں جو ہماری بائبل میں پائی جاتی ہیں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ خدا کے تواریخی مکاشفہ سے جو مسیح میں کامل ہوا خاص علاقہ رکھتی ہیں۔ صرف یہی وہ بات ہے جو بائبل کو اور کتابوں سے الگ کر دیتی ہے۔ یہی وہ گرہ ہے وہ باہم جکڑنے والا رشتہ ہے جو اُن کتابوں کو جو بائبل کے مجموعہ میں پائی جاتی ہیں ایک بناتا ہے۔ مسیح وہ مرکز ہے جس سے نور کی شعاعیں اُٹھتی اور سب نوشتوں کو روشن کرتی ہیں۔ وہی وہ آفتاب ہے جو اس کتاب کے تمام حصّوں کو اپنی کوشش سے باہم ملائے رکھتا ہے۔ پس بائبل ہی میں وہ کلام پایا جاتا ہے جس کا سُننا ہر فرد بشر پر فرض ہے۔ اسی میں وہ صدا آتی ہے جو خدا کی طرف سے اُس کے بچّوں کے لئے ہے جو اس زمین پر کلیسیا کی صورت میں بود و باش کرتے ہیں۔ اسی میں وہ کشف عامّہ اور تامہ موجود ہے جس میں سے تمام مسیحی رسوم اور اُمیدیں برآمد ہوتی ہیں اور جن میں سب مسیحی باہم مل سکتے ہیں ❊

بائبل کی یکتائی پر غور کرتے ہوئے اسی بات پر بہت زور دینا چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ اکثر اسی بات کو بھُول جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مشہور و معروف شخص جس کا نام گرِٹے ہے ایک شخص کو لکھتا ہوا کہتا ہے۔ "تمہیں انجیل سے بڑھکر اور کوئی کتاب خوبصورت نظر نہیں آتی۔ لیکن میرے سامنے ہزارہا صفحہ متقدّمین و متأخرین کے لکھے ہوئے موجود ہیں جو خدا کی ہدایت سے قید کتابت میں آئے اور جس طرح وہ خدا کی ہدایت سے تحریر ہوئے اُسی طرح وہ خوبصورت اور مفید اور بنی آدم کے لئے ضروری بھی ہیں۔" ایک اور شخص یوں گویا ہے۔ "نہیں! اے ازلی و ابدی خدا! تیرا کلام ابھی ختم نہیں ہوا۔ تیرا خیال۔ وہ خیال جو تو اس دنیا کی نسبت رکھتا ہے ابھی پورے پورے طور پر منکشف نہیں ہوا۔ وہ خیال اب تک تخلیق کے کام کو انجام دیتا ہے اور زمانوں تک جن کا شمار بنی آدم کے لئے محال ہے انجام دیتا

رہیگا" اسی طرح ایک اور شاعر جس کا نام لوئل تھا یوں اپنے خیالات کو ظاہر کرتا ہے۔
"بنی آدم کی بائیبل آہستہ آہستہ لکھی جارہی ہے۔ لیکن نہ کاغذ کے اوراق پر اور نہ پتھر کی تختیوں پر۔ ہر زمانہ اور ہر فرقہ اس میں ناامیدی یا اُمید۔ خوشی یا رنج کی آیتیں جمع کرتا جاتا ہے۔ جب تک سمندر میں تلاطم یا طغیانی آتی ہے۔ جب تک پہاڑوں کو دھند ملفوف کرتی ہے۔ جب تک رعد کی کڑک بادلوں کو تہ و بالا کرتی ہے تب تک قومیں نبی کے پاؤں کے پاس بیٹھکر سیکھتی رہینگی"*

اب جو بات اس قسم کے بیانوں میں نظر انداز کی جاتی ہے سو یہ ہے کہ گو خدا کی ہدایتیں بند نہیں ہوئی ہیں تاہم اُس کا تواریخی مکاشفہ مسیح میں کمال کو پہنچ گیا ہے۔ اور جس طرح وہ ساری باتیں جو اُس سے پیشتر وقوع میں آئیں اُس مکاشفہ کے لئے ایک قسم کی تیاری کا باعث تھیں۔ اُسی طرح وہ سب باتیں جو اُس کے بعد وقوع میں آرہی ہیں وہ اُس کے اظہار کو اور اُس کے استعمال کے موقع کو پیش کرتی ہیں لہذا اُن کی درستی یا نادرستی کا فیصلہ اُسی کی روشنی میں ہونا چاہئے۔ بائیبل کے ایک ایک ٹکڑے کو لینا اور یہ کہنا کہ ہم شیکسپیئر کی کتابوں میں سے وہ تمام علمی اور گہری حکمت اخذ کرسکتے ہیں جو امثال کی کتاب کے مطالعہ سے دستیاب ہوتی ہے یا یہ کہنا کہ ٹامس اکیمپی یا اگسطن یا بنین کی کتابوں میں ایسے ایسے مقامات پائے جاتے ہیں جو لاریب ایسے ہی منجانب اللہ ہیں جیسے غزل الغزلات کے بعض مضامین ہیں بائیبل کی فضیلت میں سرمو فرق پیدا نہیں کرتا۔ بائیبل کی مقدرت ان باتوں سے نہیں ہے گو جو کچھ شیکسپیئر اور ٹامس اکیمپی اور اگسطن اور بنین نے لکھا وہ اُسی کی خوشہ چینی کا نتیجہ تھا۔ بائیبل کی مقدرت و منزلت ان باتوں پر منحصر نہیں ہے۔ جو خوبی اور فضیلت اُس میں پائی جاتی ہے وہ اُس تعلق سے صادر ہوتی ہے جو وہ مسیح سے رکھتی ہے۔ مسیح خدا کا اعلےٰ اور انتہائی کشف ہے۔ اور بائیبل جس میں یہ مکاشفہ قلمبند ہے ایسی ہی لاثانی اور ناقابل تخریب کتاب ہے جیسے مسیح خود ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں عرفان الٰہی جلوہ گری کرتا رہا ہے۔ خدا نے کسی جگہ اپنے تئیں بغیر گواہ کے نہیں چھوڑا۔ فطرت اور ضمیر اور بالخاصہ

اُس مصیبت کے وسیلے جو گناہ کے ساتھ ملحق ہے خدا ہمیشہ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ اور بالخصوص خاص خاص افراد کے ساتھ ایسی زبان میں باتیں کرتا رہا ہے کہ اُس کی آواز کی حقیقت پر کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ تاہم اس قسم کے تمام مکاشفے مسیح کے بغیر ناتمام ہیں۔ کیونکہ اسی ایک مکاشفہ کی روشنی میں جو تمام مکاشفات کا سرتاج ہے سب باتیں صاف ہوتی ہیں اور خدا پورے پورے طور پر جانا جاتا ہے۔ پس یاد رہے کہ جو صفت بائیبل کو دیگر کتابوں سے علیحدہ کرتی ہے یہ نہیں ہے کہ اُس کا ہر حصہ خوبی اور فضیلت میں لاثانی ہے اور نہ یہ کہ خدا صرف اسی کتاب کے وسیلے بنی آدم سے بولا ہے۔ اُس کی وہ خصوصیت جو اُس کے اور دیگر کتب کے مابین حد فاصل کھینچتی ہے یہ ہے کہ اس میں خدا کے عظیم مکاشفہ کا حال قلمبند ہے +

پس یہی وہ نکتہ ہے جس میں ان کتابوں کی وحدت کے راز کی کلید پائی جاتی ہے اور جس کے سبب سے یہ کتابیں مجموعہ کتب ربانی میں داخل ہونے کی سرفرازی کا حق رکھتی ہیں۔ اور یہ کلید زبان کی کوئی خصوصیت نہیں ہے اور نہ یہ کوئی ایسی صفت ہی ہے جو یہ کتابیں اور کتابوں کے ساتھ مشترک طور پر رکھتی ہیں۔ یہ کلید وہ ہے جو اُس کی اصل خصوصیت ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے ان کتابوں کا مطلب اور ماہیت کہنا چاہیئے۔ نوشتوں سے مقدم اور اُن کی تہ میں یہ صداقت موجود ہے کہ خدا نے اپنا مکاشفہ اسرائیل میں اور اسرائیل کو عطا فرمایا۔ بائیبل ہمارے سامنے اسی مکاشفہ کا اظہار اور بیان اور تاویل پیش کرتی ہے۔ بائیبل کی وحدت خدا کے مقصد میں یا یوں کہیں یسوع مسیح میں جو مرکز ہے پائی جاتی ہے۔ وہ خدا کے مکاشفہ کا کمال ہے اور اُسی میں بائیبل کی وحدت کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ بائیبل یا تو اُسی کی زندگی کا بیان یا اُسی کے مکاشفہ کی تصویر یا تفسیر یا اُسی کی زندگی کا وعدہ یا اس کے نمودار ہونے کی تیاری کا خاکا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس مکاشفہ کے کس قدر محتاج تھے اور کس طرح اس عظیم مکاشفہ کا ظہور پذیر ہونا ممکن ٹھہرا۔ پس نوشتوں کے ہر حصہ کی غرض یا کام اُس رشتہ سے روشن ہوتا ہے جو وہ

یسوع مسیح کے ساتھ رکھتا ہے ۔

دوسرا باب

الہامی نوشتوں کا مجموعہ اور اسکی تدوین کے اصول و قواعد

انگریزی زبان میں جو لفظ الہامی صحائف کے مجموعہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کینن ہے۔ کینن یونانی لفظ ہے اور اس کے اصل معنے قاعدے یا قانون کے ہیں۔ ابتدا میں اس لفظ سے وہ اصول یا قاعدہ مراد تھا جس کے وسیلہ سے کسی کتاب کے الہامی یا غیر الہامی ہونے کی حقیقت ظاہر ہو جاتی تھی۔ یا یوں کہیں کہ یہ وہ کسوٹی یا معیار تھا جس کے ذریعے سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آیا فلاں کتاب منجانب اللہ ہے یا نہیں۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس لفظ کا اطلاق اس مجموعہ کتب پر ہونے لگا جو کسوٹی پر کسے جانے کے بعد ایک جلد میں جمع ہو گیا تھا۔ پس اب ان کتابوں کے مجموعہ کو جو بائبل میں جمع ہیں اصطلاح میں کینن آف سکرپچر (Canon of Scripture) کہتے ہیں۔ جو کتاب اس مجموعہ میں شامل ہوا اسے کینانیکل (Canonical) اور جو شامل نہ ہو اسے ان کینانیکل (Un-canonical) بولتے ہیں۔ ان اصطلاحی الفاظ کو اور ان کے مفہوم کو اچھی طرح یاد کر لینا چاہئے کیونکہ اس باب میں سہولت کے لئے یہی الفاظ حسب موقع استعمال کئے جائینگے ۔

اب جو سوال درپیش ہے وہ یہ ہے کہ کس اصول کے مطابق بائبل کا مجموعہ یعنی کینن آف سکرپچر جس کا ذکر اوپر ہوا تیار کیا گیا۔ وہ کون سی کسوٹی تھی جس کے وسیلے سے قدما اس بات کے قائل ہوئے کہ جو کتب مقدسہ بائبل میں پائی جاتی ہیں وہ من جانب اللہ ہیں اور قبول کرنے کے قابل؟ اس سوال کا جواب

پانے کے لئے مناسب ہے کہ ہم اُس مباحثے پر غور کریں جو لوتھر اور علمائے کلیسیائے روم کے مابین واقع ہوا ۔
اگر آپ کسی رومن کاتھولک سے پوچھیں کہ آپ فلاں فلاں کتاب کو کس بنا پر کینانیکل مانتے ہیں تو وہ آپ کو فوراً ایسا جواب دیگا جس کے سمجھنے میں آپ کو کسی طرح کی دقت پیش نہیں آئیگی ۔ چنانچہ وہ کہہ دیگا کہ میں ان کتابوں کو اس لئے کینانیکل مانتا ہوں کہ کلیسیا مجھے اسی طرح ماننے کی تلقین کرتی ہے ۔ کلیسیا نے بعض کتابوں کی نسبت فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ کینانیکل ہیں اور وہ کلیسیا کے فیصلہ کو قبول کر کے اُنہیں کینانیکل مان لیتا ہے ۔ لیکن اگر آپ یہی سوال کسی پراٹسٹنٹ سے پوچھیں کہ آپ کس بنا پر اُن کتابوں کو جو آپ کی بائبل میں پائی جاتی ہیں کینانیکل مانتے ہیں؟ وہ کونسا اصول ہے جس کے مطابق آپ نہ اُن کتابوں سے زیادہ کو اور نہ کم کو الہامی قرار دیتے ہیں؟ تو شائد اُن میں سے مشکل سے ایک فیصدی آپ کو تسلی بخش جواب دیگا ۔ پراٹسٹنٹ رومن کاتھولک کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ اپنی رومن کاتھولک کلیسیا کے فیصلہ اور اختیار پر تکیہ کرتے ہیں ۔ لیکن قابل افسوس یہ بات ہے کہ پراٹسٹنٹوں میں بہت ایسے ہیں جو یہ نہیں بتلاسکتے کہ وہ خود کس کے فیصلہ پر تکیہ کرتے ہیں ۔ پراٹسٹنٹوں کا یہ تکیہ کلام ہے ۔ "بائبل ۔ پوری بائبل اور صرف بائبل ہی ہماری ہدایت کے لئے ضروری اور کافی ہے ۔" مگر کتنے پروٹسٹنٹ ایسے ہیں جو اس بات کو صفائی سے دکھا سکتے ہیں کہ ہماری بائبل میں جو کتابیں پائی جاتی ہیں فقط وہی الکتاب ہیں کہ اُن میں سوائے کینانیکل کتب کے اور کوئی کتاب نہیں ہے ۔ اگر آپ اُن سے پوچھیں کہ ثابت کرو کہ اس مجموعہ میں کوئی اُن کینانیکل کتاب داخل نہیں کی گئی اور نہ کوئی کینانیکل صحیفہ اس میں سے خارج کیا گیا ہے تو وہ اس کا کیا جواب دینگے؟ کس طرح اس عقدے کو حل کرینگے؟ اگر آپ اُن میں سے کسی سے یہ دریافت کریں کہ آپ کس بنا پر پطرس کے دوسرے خط کو کینانیکل مانتے ہیں حالانکہ قدیم کلیسیا کے بہت سے حصے نے اسے کینانیکل نہیں مانا ہے ۔ اور کس طرح یعقوب کے خط کو کینانیکل تسلیم کرتے ہو باوجودیکہ لوتھر جو

ریفارمیشن اور پراٹسٹنٹزم کا بانی تھا خود اس خط کی نسبت کئی شکوک اپنے دل میں رکھتا تھا؟ اگر آپ اُس سے یہ سوال کریں تو وہ ان کا اور کیا جواب دے سکتا ہے بجز اس کے کہ میں ان خطوط کو اس لئے کینانیکل مانتا ہوں کہ اُس کلیسیا نے جس کے ساتھ میرا تعلق ہے ان کو ایسا ہی تسلیم کیا ہے۔ تو پھر رومن کاتھولک اور پراٹسٹنٹوں میں تدوین صحائف کے متعلق کیا فرق ہوا؟ کیا اس صورت میں رومن کاتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں اپنی اپنی کینانیکل کتابوں کو کلیسیا کے فیصلہ کے زور پر قبول نہیں کرتے؟

آؤ ہم تھوڑی دیر کے لئے غور کریں کہ آیا اس سوال پر کسی نواح سے روشنی گر سکتی ہے یا نہیں۔ بہتر ہوگا اگر ہم پہلے تھوڑے عرصہ کے لئے اس بات پر غور کریں کہ رومن کاتھولک کلیسیا نے اس اہم مضمون پر ریفارمیشن کے وقت کیا فیصلہ کیا۔ کونسل آف ٹرنٹ (رومن کاتھولکوں کی کونسل عامہ) کے سامنے لوتھر کی بدعت کے متعلق چار دعوے رکھے گئے تھے۔ اُن میں سے دو کا علاقہ بائیبل کے ساتھ۔ پہلا یہ تھا کہ نوشتے ہی تعلیم کا اصل اور کامل چشمہ ہیں۔ اور دوسرا یہ تھا کہ پُرانے عہدنامہ کا عبرانی کینن (مجموعہ) اور نئے عہدنامہ کی مسلّمہ کتابیں ہی فیصلہ کن مانی جائیں۔ پس ۸ اپریل ۱۵۴۶ء کو یہ حکمنامہ یا فیصلہ کلیسیائے روم کی طرف سے نافذ ہوا۔ "ٹرنٹ کی پاک اور ایکیومینیکل (جس میں جگہ جگہ کے پریسٹ اور بشپ شامل ہوں) سنڈ جو باقاعدہ طور پر روح القدس کے وسیلے فراہم ہوئی ..... اور جو ہمیشہ اس مدعا کی کاربند رہی کہ بدعتوں کو دُور کرے اور اُس انجیل کی اصل حقیقت کو بے داغ رکھے۔ جس کا وعدہ پہلے نبیوں اور پاک نوشتوں نے کیا اور بعد میں جس کی منادی پہلے ہمارے خداوند یسوع مسیح ابن اللہ نے کی اور پھر اپنے رسولوں کو حُکم دیا کہ ہر مخلوق کے سامنے اُس کی منادی کریں اور بتائیں کہ وہ ہر سچائی اور نجات بخش صداقت کا منبع ہے اور چال چلن کی ہدایت بھی اُسی سے ملتی ہے۔ اور (یہ کونسل) اس بات کو مانتی ہے کہ یہ صداقت اور ہدایت لکھی ہوئی کتابوں میں پائی جاتی ہے اور نیز اُن بے لکھی حدیثوں میں موجود ہے جو یا تو رسولوں نے

خود مسیح کی زبان سے سُنی تھیں یا روح القدس کے وسیلے اُن پر ظاہر کی گئی تھیں اور جو دست بدست ہمارے زمانہ تک پہنچ گئی ہیں۔ اور (یہ کونسل) مسیحی عقائد کے پابند آبا کے نقش قدم پر چل کر پُرانے عہد نامہ کی کتابوں کو نئے عہد نامہ کی کتابوں کی مانند صدق اور ادب سے قبول کرتی اور اُن کی تعظیم و تکریم بجالاتی ہے۔ اور نیز مانتی ہے کہ ایک ہی خدا دونوں عہد ناموں کا مصنف ہے۔ اور اسی طرح وہ اُن حدیثوں کا بھی مصنف ہے جو ایمان اور اخلاق سے متعلق ہیں۔ جو مسیح کے مُنہ سے نکلیں یا روح القدس نے بتلائیں اور کاتھولک کلیسیا میں بذریعہ مسلسل تواتر کے محفوظ ہیں تاکہ ان کتابوں کے متعلق کسی طرح کے شکوک و شبہات باقی نہ رہیں اور سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ کونسی کتابیں ہیں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلہ کے ساتھ بطور تتمہ اُن کی فہرست مربوط کی جائے"۔ اس کے بعد کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جس میں پُرانے عہد نامہ کی کتابیں اور اپاکرافا اور نئے عہد نامہ کی کتابیں شامل ہیں۔ زاں بعد کونسل کا فیصلہ ایک لعنت کے ساتھ ختم ہوتا ہے جو اُن پر بھیجی جاتی ہے جو ان کتابوں کو یا ان کے حصوں کو مقدس اور کینانیکل تصور نہیں کرتے"۔ اس صورت میں جس میں کہ وہ کلیسیا میں پڑھے جاتے اور ولگیٹ کی پُرانی لاطینی جلد میں درج ہیں"۔

اس سے پہلے بھی کونسلوں نے کینن کے مضمون پر غور کیا تھا اور اُس پر اپنی رائے بھی دی تھی مگر یہ کونسلیں ایکومینیکل نہ تھیں لہذا اُن کے فیصلے قابل تقلید نہ سمجھے گئے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ٹرنٹ کی کونسل مجبور ہوئی کہ اس امر پر غور کرے اور اس کے متعلق کوئی پکا فیصلہ کرے تو اس سے آپ ہی آپ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کونسل کے پاس کسی اگلی کونسل کا فیصلہ موجود نہ تھا جس کا حوالہ دیا جا سکتا پس اس وقت تک کینن کا معاملہ رواج پر معلق رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ جیروم کا لاطینی ترجمہ جو ولگیٹ کہلاتا ہے عالمگیر طور پر مستعمل تھا۔ اور اس کا یہ اثر ہوا کہ مغربی کلیسیا نے انہی کتابوں کو جو اس میں پائی جاتی تھیں کینن یعنی مجموعہ کتب مقدسہ مان لیا۔ لیکن جیروم اُن کتابوں کے اندراج کے متعلق جو اُس نے

اپنے مجموعہ میں درج کی ہیں۔ کوئی سائنٹفک اصول اوّل سے آخر تک نہیں برتا۔ بلکہ وہ اس رائے کا محکوم رہا جو عام طور پر ان کتابوں کے متعلق مروج تھی۔ یعنی اُس نے اس بات کی رعایت رکھی کہ قدیم کلیسیا کے خیال کو جدید زمانہ کی رائے پر ترجیح دی جائے اور قلیل گروہ پر کثرت رائے کو فوق حاصل ہو +

پس ریفارمیشن سے پہلے کینن کا سوال ایک طرح التوا میں پڑا رہا۔ اور کلیسیا نے عملی طور پر اس سوال کا فیصلہ جیروم کے لاطینی ترجمہ کے مطابق کیا۔ یعنی جب دیکھا کہ لوگ اُسے ہر جگہ قبول کر بیٹھے اور اُسے بکثرت استعمال کرتے ہیں تو اُسی کو کینن کا اندازہ سمجھ لیا۔ اور جیروم نے اس کا فیصلہ اُس رائے کے متعلق کیا جو اُس کے زمانہ میں کلیسیا کے درمیان مروج تھی۔ نہ کسی ایسے اصول یا معیار کے استعمال سے جو کینن کے فیصلہ میں کسوٹی کا کام دیتا۔ مگر یہ ماننا پڑتا ہے کہ کلیسیا کا فیصلہ بھی اور جیروم کا فیصلہ بھی اس بات پر مبنی تھا کہ جو کتابیں رسولوں نے لکھی ہیں وہی کینانیکل مانی جائیں۔ اس اصول کا اظہار طرطولیان نے اچھی طرح کر دیا تھا۔ اور اگر بعض کتابیں کینانیکل نہیں مانی گئی تھیں تو اس کا یہ سبب تھا کہ اُن کی نسبت یہ فیصلہ قطعی طور پر نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ رسولوں کی تصنیف ہیں +

اس سوال کا یہ عملی حل کچھ عرصہ تک کافی سمجھا گیا۔ یعنی جب تک بائبل محض روحانی زندگی کی تقویت کے لئے ایک ضروری کتاب سمجھی گئی یا عبادت کے اغراض کی انجام دہی کے لئے مستعمل ہوتی رہی تب یہ حل کافی تھا۔ لیکن جب لوتھر اور اُسکے رفقا نے بائبل ہی کو تمام مذہبی اور کلیسیائی معاملات کے فیصلے کا ایک اکیلا قانون بنایا۔ اور یہ چاہا کہ اُس کی تعلیم اور ہدایت کی بنا پر اُن تمام باتوں کو رد کریں جن کا بوجھ اُن کے کندھوں پر کلیسیا نے ڈال رکھا تھا۔ جب اُنہوں نے یہ تحریک شروع کی کہ بائبل ایسی شریعت نہیں ہے جس کی تشریح اور شریعتوں اور قانون سے کی جائے بلکہ وہ ایک ایسی شریعت ہے جو اکیلی ایمان اور زندگی کا قانون ہے تب اس بات کی ضرورت پڑی کہ صفائی کے ساتھ اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ وہ کونسی کتابیں ہیں جن میں یہ شریعت پائی جاتی ہے اور انہوں نے یہ اختیار کہاں سے پایا ہے؟

ان سوالات کا جواب دینے میں رومن کاتھولک کلیسیا کو کوئی دقت پیش نہ آئی کونسل آف ٹرنٹ ابھی وقوع میں بھی نہیں آئی تھی کہ اس کلیسیا کے ایک تھیولوجین نے یہ سوال کیا "اگر تم کلیسیا کی گواہی کو نہ مانو تو تم کس طرح جان سکتے ہو کہ نوشتے کینانیکل ہیں"؟ ایک اَور نے یہ کہا تھا۔" نوشتوں کو جو اختیار ہمارے درمیان حاصل ہے ضرور ہے کہ وہ کلیسیا کے اختیار پر مبنی ہو" کلیسیا ہی نے بعض کتابوں کو الہامی اختیار منسوب کیا ہے انہوں نے یہ اختیار نہ خود پایا اور نہ اُن کے مصنفوں نے اُنہیں دیا" جب اُک (ایکّ) نے پرگیٹوری (اعراف) کے اثبات میں دوسرے مکابیوں میں سے ایک مقام پیش کیا تو لوتھر نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہ کتاب الہامی یا کینانیکل نہیں ہے اُک نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا" لیکن کلیسیا نے ان کتابوں کو کینن میں جگہ دی ہے" لوتھر نے اس جواب کا یہ جواب دیا" کلیسیا کو یہ اختیار نہیں ہے کہ کسی کتاب کو وہ اختیار یا طاقت دے جو اُس میں آگے موجود نہیں ہے۔ کوئی کونسل کسی کتاب کو جو اپنی ذات میں الہامی نہیں ہے الہامی نوشتہ نہیں قرار دے سکتی"

مرقومہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ اس امر کے متعلق لوتھر اور رومن کاتھولکوں میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ کلیسیائے روم نے یہ فیصلہ کیا کہ پرانے عہدنامہ کی کتابیں جن میں اپاکرافا بھی شامل ہیں اور نئے عہدنامہ کی کتابیں (جیسی کہ وہ ہماری بائبل میں اب پائی جاتی ہیں) الہامی کلام کے طور پر قبول کیجائیں اُن کی معتبری کی نسبت اُنہوں نے اور کسی طرح کی تحقیق کو روا نہ رکھا۔ اور اس معاملہ کی ساری بحث کو جیروم صاحب کے ترجمہ موسومہ ولگٹ کو قبول کر کے تہ کر دیا لیکن لوتھر ایسا آسان طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اُس نے کلیسیا کے اختیار کی عمارت کو گرا دیا تھا۔ وہ مجبور تھا کہ صاف صاف طور پر دکھائے کہ وہ خود کس اختیار پر تکیہ کرتا تھا۔ چونکہ وہ فقط خدا کے کلام کے تحکم کا قائل تھا اس لئے ضرور تھا کہ وہ دکھائے کہ خدا کا کلام کہاں پایا جاتا ہے اور کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور یہ نہیں ہے؟ لوتھر کے سامنے دو سوال تھے جن کا جواب

دینا ضروری امر تھا - اوّل یہ کہ وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر آدمی قائل ہوتا ہے کہ نوشتے خدا کا کلام ہیں - لہذا اُس کا فرض ہے کہ اُن کے اختیار کو قبول کرے - دوسرا سوال یہ تھا کہ وہ کونسی کتابیں ہیں جو پاک نوشتے قرار دی جا سکتی ہیں ؟ اس سوال سے پہلے کہ " الہامی نوشتوں کا کینن (مجموعہ) کیا ہے" ؟ یہ سوال آتا ہے کہ " الہامی نوشتے ہیں بھی" ؟ اس سوال سے پیشتر کہ " کونسی کتابوں میں خدا کا کلام درج ہے" ؟ اس سوال کا جواب دینا پڑتا ہے " کہیں خدا کا کلام ہے بھی" ؟ جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ دوسرے سوال کے مُتعلق لوتھر کی کیا رائے تھی تب تک ہم اُس جواب کو جو اُس نے پہلے سوال کے مُتعلق دیا اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ۔

اب لوتھر کے قول کے مطابق اس سوال کا جواب کہ کیا دُنیا میں خدا کا کلام پایا جاتا ہے یا نہیں ؟ کیا خدا بنی آدم سے ہمکلام ہوا یا نہیں اثبات کی صورت میں اور بڑے یقین کے ساتھ دیا جا سکتا ہے - اور ہر ایک شخص جس پر خدا کا کلام اپنی الٰہی اصل اور اختیار کو ظاہر کرتا ہے اس سوال کا جواب بصورت اثبات دے سکتا ہے - مگر جس پر خدا کے کلام کی الٰہی اصلیت اور اختیار آشکارا نہیں ہوا وہ اس کا جواب اثبات کی صورت میں نہیں دے سکتا ۔

لوتھر بڑی صفائی سے اور بار بار یہی تعلیم دیتا ہے کہ خدا کا کلام اپنی شہادت اپنے میں رکھتا ہے - وہ اس بات کا محتاج نہیں کہ کوئی اَور اُس کی تائید کرے - اُس کا ثبوت خود اُس کے اندر موجود ہے - اب ہم اُن پر زور الفاظ کو پیش کرینگے جو اُسکی زبان سے اس معاملے کے متعلق نکلے - ایک جگہ پہلے وہ یہ کہتا ہے کہ میرے اور رومن کاتھولک کے درمیان بحث اس بات پر نہیں کہ آیا خدا کے کلام کی فرمانبرداری کرنی چاہئیے یا نہیں - اس بات پر ہم دونوں متفق ہیں " مگر رومن کاتھولک کلیسیا کے لوگ کہتے ہیں کہ ہاں اُس کے کلام کی فرمانبرداری تو کرنی چاہئیے - مگر ہم یہ کس طرح دریافت کر سکتے ہیں کہ خدا کا کلام کہاں ہے اور یہ کیونکر جان سکتے ہیں کہ یہ سچا کلام ہے اور یہ جھوٹا ہے ؟ اس بات کی خبر ہمیں پوپ سے یا کونسلوں سے ملتی ہے - اگر رومن کاتھولک یہ ماننا چاہیں تو کریں - مگر میں پھر بھی یہی کہتا ہوں کہ تو اپنا یقین

اُن پر (یعنی پوپوں وغیرہ پر) قائم نہیں کر سکتا ہے۔ اور نہ اس سے تیری ضمیر آسودہ ہو سکتی ہے۔ اس بات کا فیصلہ تجھے خود کرنا ہے۔ تیری اپنی گردن۔ تیری اپنی زندگی معرض خطر میں ہے۔ پس لازم ہے کہ خدا تجھ سے تیرے ہی دل کے اندر بولے اور بتائے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ ورنہ (باوجود پوپ کا کہنا ماننے کے) یہ معاملہ تیرے لئے بغیر فیصلہ کے رہیگا۔" دوسری جگہ یہ کہتا ہے۔ "تجھے اس بات کا کہ یہ خدا کا کلام ہے ایسا یقین ہونا چاہئے جیسا تجھے اس بات کا یقین ہے کہ تو زندہ ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یقین ہونا چاہئے۔ کیونکہ اسی فیصلہ پر تیری ضمیر کو تکیہ کرنا لازم ہے۔ اگر سب بنی آدم آئیں۔ بلکہ اگر فرشتے بھی اور اُن کے ساتھ دُنیا بھی آئے اور کچھ فیصلہ کرے لیکن اگر تو خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تو تُو برباد ہو چکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تجھے پوپ کے فیصلہ یا کسی اور شخص کے فیصلہ کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔ تجھے آپ ایسا ماہر ہونا چاہئے کہ تو یہ بتا سکے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ اور یہ نہیں ہے۔ یہ درست ہے اور یہ نادرست ہے۔ ورنہ تکالیف کا برداشت کرنا ناممکن ہو جائیگا۔ کیا تو پوپ پر یا کونسلیا پر قائم ہے؟ اگر ایسا حال ہے تو یہ ناممکن نہیں کہ شیطان آئے اور تجھے یہ کہکر ورغلائے کہ اگر پوپ کی یہ بات جھوٹ ہو تو پھر تیرا کیا حال ہوگا؟ اگر اُس نے غلطی کی ہے تو کہہ تو کیا کریگا"؟ اس قسم کے شکوک اگر پیدا ہو جائیں تو تو بالکل پست خاطر اور بیدل ہو جائیگا۔ پس لازم ہے کہ تو خود اپنی ضمیر سے کام لے تاکہ تو بڑی دلیری اور زور سے کہہ سکے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ اس کے لئے میں اپنا بدن اور اپنی جان بھی قربان کر دونگا۔ اگر لاکھ سر ہوں تو سب اُس کے لئے دیدونگا۔ کوئی شخص مجھے اُس کلام سے منحرف نہیں کر سکتا جو خدا نے مجھے سکھایا ہے۔ اُس کا علم مجھے ایسے ہی یقین کے ساتھ ہونا چاہئے جیسے یقین کے ساتھ اس بات کا علم ہوتا ہے کہ دو اور تین مل کر پانچ ہوتے ہیں۔ اور کہ کل نصف سے بڑا ہوتا ہے۔ یہ بات پکی اور یقینی ہے۔ اگر ساری دُنیا مجھے اس کے برعکس کہے تو میں تو بھی نہیں مانونگا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کا نقیض صحیح نہیں ہوتا۔ اب ان باتوں کی نسبت میرے لئے کون فیصلہ کرتا ہے؟ کوئی آدمی فیصلہ نہیں کرتا۔ سچائی خود میرے فیصلہ کو قائم کرتی ہے کیونکہ

وہ ایسی صریح اور یقینی ہے کہ کوئی اُس کا انکار نہیں کرسکتا ؟ +

اب لوتھر اس پوائنٹ پر کیوں اتنا زور دیتا ہے ؟ وہ اس لئے اتنا زور دیتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ جو فرق میرے اور رومن کاتھولکوں کے درمیان پایا جاتا ہے وہ اسی مسئلہ پر معلق ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر میں نے اس بات کو ثابت نہ کیا کہ سچائی ہیں یا یوں کہیں کہ خدا کے کلام میں یہ قدرت پائی جاتی ہے کہ اپنے آپکو انسان کی ضمیر پر جو اُس کے وسیلے سے جاگ اُٹھتی ہے سچا ثابت کرے تو میرا کچھ ٹھکانا نہیں۔ پس وہ بات جس کے سبب سے وہ پراٹسٹنٹ کہلایا اور جس کے سبب سے اور لوگ پراٹسٹنٹ کہلاتے ہیں یہی ہے کہ انسانی روح کو کسی شخص کی وساطت کی ضرورت نہیں کہ اُس کے وسیلے سے خدا اور خدا کی سچائی کے ساتھ پیوند ہو کیونکہ نہ خدا اور نہ اُس کی سچائی اس قسم کی وساطت کے محتاج ہیں۔ وہ اپنی حقیقت کو آپ ہی آپ ہر متنفس پر ظاہر اور ثابت کرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ لوتھر انجیل کو اس لئے نہیں مانتا تھا کہ وہ ایک الہامی کتاب ہے۔ یا الہامی کتب کے مجموعہ میں داخل ہے۔ یا خدا کا کلام ہے۔ وہ اُسے اس لئے مانتا تھا کہ اُس کے وسیلے سے اُس کی روح نے زندگی پائی تھی۔ اور اس سے اُس کا منجانب اللہ ہونا اُس پر ظاہر ہوگیا تھا۔ اُس نے مسیح کو اس واسطے قبول نہیں کیا تھا کہ اُس کا ذکر اُن نوشتوں میں پایا جاتا تھا جنہیں اُس نے اُسکو قبول کرنے سے پہلے تسلیم کرلیا تھا۔ نہیں۔ اُس نے نوشتوں کو اسی لئے مانا تھا کہ اُن میں اُس مسیح کی گواہی پائی جاتی تھی جس کے قبول کرنے کے لئے وہ مجبور تھا۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ وہ نوشتوں کو خدا کا کلام اُس صداقت کے سبب سے مانتا تھا جو اُن میں قلمبند ہے۔ وہ صداقت کو اس لئے نہیں مانتا تھا کہ وہ اُن نوشتوں میں مندرج ہے جو اُس کے نزدیک خدا کا کلام تھے۔ وہ انہیں اس لئے مانتا تھا کہ خدا کے فضل کے اعلان نے اُس کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کردی تھی اور اس سے اُس نے جان لیا کہ وہ فضل کی خوشخبری جو نوشتوں میں درج ہے خدا کی طرف سے ہے +

اب ہم نے دیکھا کہ رومن کاتھولکوں اور پراٹسٹنٹوں میں جو بات حد فاصل

کا کام دیتی ہے یہ نہیں ہے کہ رومن کاتھولک اپنی کلیسیا کو مبرا عن الخطا سمجھکر ایک بااختیار اور فیصلہ کن منصف قرار دیتے ہیں۔ اور پراٹسٹنٹ کلیسیا کے عوض میں کلام الٰہی کو مبرا عن الخطا سمجھتے ہیں۔ نہیں جس بات میں فرق پایا جاتا ہے وہ اس سے کہیں گہری ہے۔ کیونکہ رومن کاتھولک بھی پراٹسٹنٹوں کی طرح کلام اللہ کے اختیار کے قائل ہیں پھر فرق کس بات میں ہے؟ فرق اس بات میں ہے کہ رومن کاتھولک نوشتوں کو خدا کا کلام اس واسطے مانتے ہیں کہ کلیسیا ایسا ماننے کا حکم دیتی ہے لیکن پراٹسٹنٹ اُنہیں کلام الٰہی اس لئے مانتا ہے کہ خدا کہتا ہے کہ انہیں میرا کلام سمجھکر قبول کرو۔ پراٹسٹنٹ دیکھتا ہے کہ خدا نے ان نوشتوں کے وسیلے سے میرے ساتھ ایسے طور پر باتیں کی ہیں کہ میں قائل ہوں کہ وہ خدا کی زبان مبارک سے نکلے ہیں یہی وہ محکم اور پختہ بنیاد ہے جس پر پراٹسٹنٹ ازم قائم ہے۔ انسان کی روح خدا کی اُس آواز کو جو نوشتوں میں سے آتی ہے اور جو اپنا ثبوت اپنے میں رکھتی ہے سُنتی ہے اور اُسے قبول کرتی ہے۔ پس ایماندار کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ کلیسیا سے دریافت کرنے جائے کہ آیا بائیبل کے نوشتے خدا کا کلام ہیں یا نہیں۔ اُسکی ضمیر اُسے بتاتی ہے کہ وہ خدا کا کلام ہیں۔ اس سے گہری بُنیاد ایمان و اعتقاد کے لئے میسر نہیں ہو سکتی۔ اور جو عقیدہ اس گہری بنا پر مبنی نہیں ہے وہ مضبوط اور مصئون نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایک مُدّت تک قائم رہے اور ممکن ہے کہ انسان کو ضروری فوائد بھی اُس سے دستیاب ہوں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اس خطرے میں ہے کہ کسی نہ کسی وقت جنبش میں آجائے ÷

پس لوتھر کا پہلا عقیدہ نوشتوں کی بابت یہی تھا اور اسی پر تمام پراٹسٹنٹ ازم مبنی ہے کہ "نوشتوں کے وسیلے سے خدا خود ایسے طور پر کلام کرتا ہے کہ انسان بدون وساطت کسی خارجی ثبوت یا ہادی کے اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کا کلام ہیں۔ انسان اس بات کا محتاج نہیں کہ کلیسیا اُسے بتائے کہ وہ خدا کا کلام ہیں۔ خدا خود اُسے اُنہیں نوشتوں کے ذریعے بتا دیتا ہے کہ یہ میرا کلام ہیں۔ اور

یوں غیر کی وساطت غیر ضروری ثابت ہو جاتی ہے +

اس بات کے بعد ایک اور امر فیصلہ طلب سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کونسے نوشتوں میں کلام الٰہی مندرج ہے؟ کیا ہم کلام الٰہی کی شناخت کے لئے ہر حالت اور ہر صورت میں اصول مرقومۂ بالا کو کام میں لائیں اور یہ کہیں کہ فقط وہی کتابیں الہامی نوشتے گردانی جائیں جو ہمارے اُس ایمان کو جو ہم خدا کی نسبت پیشتر ہی سے رکھتے ہیں تازہ اور مضبوط کر کے اپنے تئیں من جانب اللہ ثابت کرتی ہیں؟ کیا ہم فقط اسی اصول کو کہ خدا کا کلام اپنا ثبوت آپ ہے کینن آف سکریچر کا مسئلہ حل کرتے وقت اپنا معیار سمجھیں؟ یا ہم یہ کہیں کہ جو کتاب اُس کلام سے جس نے پہلے پہل ہمارے اندر ایمان پیدا کیا مطابقت رکھتی ہے اور ہمارے سامنے وہی خوش خبری اور وہی مسیح لاتی ہے وہ کینانیکل ہے؟ (لوتھر یہی مانتا تھا مگر اس اصول کو صرف اُنہیں کتابوں پر چسپاں کرتا تھا جو رسولی حلقہ سے نکلی تھیں)۔ یا کیا ہم اس سوال کا جواب دیتے وقت اپنے ایمان کو معیار قرار دیں اور فقط یہ دریافت کریں کہ کون سی کتابیں رد کرنے کے قابل ہیں۔ یعنی یہ فیصلہ کریں کہ وہ کتابیں جو اُس ایمان کے ساتھ جس نے ہمیں روحانی زندگی بخشی مطابقت نہیں رکھتی ہیں۔ یا اُس کو رد کرتی ہیں ترک کی جائیں۔ واضح ہو کہ تین صورتوں میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ (۱) کیا میں یہ کہوں کہ وہ تمام کتابیں جو میرے دل میں ایمان پیدا کرتی ہیں کینانیکل ہیں؟ (۲) یا میں یہ کہوں کہ وہ تمام کتابیں کینانیکل ہیں جو میرے سامنے اُسی مسیح کو لاتی ہیں جس کے نظارے نے پہلے پہل میرے اندر ایمان کو پیدا کیا؟ (۳) یا کیا میں یہ کہوں کہ وہ کتابیں الہامی نہیں ہیں جو اُس ایمان سے جو میں مسیح پر رکھتا ہوں مطابقت نہیں رکھتی ہیں؟

اب ہم اس سوال کا جواب لوتھر کے اُن فیصلوں میں تلاش کرینگے جو اُس نے اُن کتابوں کے متعلق کئے ہیں جو ہمارے کینن میں داخل ہیں۔ جب ہم اُس کے نئے عہدنامہ کے ترجمہ کا ملاحظہ کرتے ہیں تو یہ بات ہماری نظر سے گزرتی ہے کہ چار کتابیں یعنی عبرانیوں کا خط۔ یعقوب کا خط۔ یہوداہ کا خط اور مکاشفات جنہیں وہ

رسولی تصنیفات نہیں سمجھتا تھا آخر میں ایک جگہ اکٹھی رکھی گئی ہیں اور اُنکے شروع میں بطور دیباچہ کے یہ معنی خیز الفاظ مرقوم کئے گئے ہیں " یہاں تک تو ہم نئے عہدنامہ کی اُن کتابوں پر غور کرتے رہے ہیں جن پر کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہوسکتا اور جو خاص کتابیں نئے عہدنامہ کی سمجھی گئی ہیں۔ مگر ذیل کی چار کتابیں گزشتہ زمانہ میں مختلف قسم کا پہلو رکھتی تھیں " زاں بعد وہ مختصر مگر مدلل طور پر اس بات کو ثابت کرتاہے کہ عبرانیوں کا خط پولوس کی تصنیف نہیں اور نہ کسی اور رسول کا تصنیف کردہ ہے۔ پہلے وہ اسکی خوبیوں کی تعریف کرتاہے اور پھر اُن نقصوں کو جنہیں وہ نقص سمجھتا ہے ظاہر کردیتاہے۔ اور زاں بعد یہ الفاظ تحریر کرتاہے " اگرچہ اس خط کا مصنف ایمان کی وہ بنیاد نہیں رکھتا جو رسولوں کا خاص کام ہے۔ تاہم وہ سونے اور چاندی اور بیش قیمت پتھروں کے ردے لگاتاہے۔ اور گو وہ کہیں کہیں گھاس پھوس بھی ملادیتا ہے۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اُس کی تعلیم کو تعظیم کے ساتھ قبول نہ کریں۔ گو یہ خط ساری باتوں میں رسولوں کے خطوط کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا۔ توبھی مناسب ہے اس کی تعظیم کی جائے " اس سے بھی زیادہ دلیری اور صفائی سے اُس نے اُن نکتہ چینیوں میں کام لیا ہے جو مکاشفات کی کتاب کے متعلق کی ہیں۔ مثلاً وہ کہتاہے "میری طبیعت اس کتاب کو کبھی پسند نہیں کرسکتی۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ میری رائے میں اس کتاب کے اندر مسیح کے بارے میں تعلیم نہیں پائی جاتی " لیکن کچھ عرصہ کے بعد اُس کی اس رائے میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ گو تادم مرگ وہ اس بات کا قائل نہ ہوا کہ اس کتاب کا مصنف یوحنا رسول ہے۔ توبھی اس میں شک نہیں کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اس کتاب کے متعلق ایسی ہلکی رائے دینا نامناسب سمجھتا تھا۔ جو دیباچہ اُس نے یعقوب کے خط پر لکھاہے اُس میں وہ وہ معیار پیش کرتاہے جس سے وہ کسی کتاب کے الہامی یا غیر الہامی ہونے کو جانچا کرتا تھا۔ ہم اوپر عرض کرچکے ہیں کہ وہ اس خط کو نئے عہدنامہ کی اصل کتابوں میں جگہ نہیں دیتا تھا۔ اور نہ اُسے کسی رسول کی تصنیف ہی سمجھتا تھا۔ اس خیال کی تائید میں ذیل کے الفاظ تحریر کرتاہے " تمام متبرک اور اصل کتابیں جس بات میں متفق ہیں وہ یہ ہے

کہ وہ سب مسیح کی بشارت دیتی ہیں اور اُسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ میری رائے میں ہر کتاب کی حقیقت کے پرکھنے کا یہی ایک سچا معیار ہے پس ہمیں ہر کتاب کے متعلق یہی دیکھنا چاہئے کہ آیا وہ مسیح کو پیش کرتی ہے یا نہیں کیونکہ سب نوشتے مسیح ہی کی گواہی دیتے ہیں (رومی ۳ : ۲۱)۔ مقدس پولوس تو مسیح میں ایسا محو تھا کہ وہ سوائے اُس کے اور کچھ جاننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی کتاب یسوع کو پیش نہیں کرتی وہ رسولی نہیں ہے خواہ وہ پطرس یا پولوس ہی کی لکھی ہوئی کیوں نہ ہو۔ اور جو کتاب مسیح کی بشارت سے مملو ہے وہ رسولی ہے خواہ اُس کا مصنف یہودا اسکریوطی یا اناّ یا پلاطوس یا ہیرودیس ہی کیوں نہ ہو"۔

صاف ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے کیناٹیکل ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق کے لئے جو معیار لوتھر پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا کتاب زیر نظر کا مرکز مسیح ہے یا کوئی اَور چیز ہے۔ ڈارنر صاحب بھی یہی بتلاتے ہیں کہ "لوتھر کے خیال کے مطابق (جس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں) کسی کتاب کے کیناٹیکل یا غیر کیناٹیکل ہونے کا فیصلہ اس بات پر منحصر تھا کہ آیا وہ کتاب مسیح کو پیش کرنا اپنا اعلےٰ مقصد سمجھتی ہے یا نہیں"۔ لوتھر کا اعتقاد دراصل یہ تھا کہ خدا اپنا مکاشفہ ایک خاص مقصد کو پورا کرنے کے لئے عطا فرماتا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ اُس کی مرضی جو ہماری نجات سے وابستہ ہے ہم پر ظاہر ہو جائے جسے بہ تبدیل الفاظ یوں کہنا چاہئے کہ اس کا مسیح جو نجات دینے والا ہے ہمارے سامنے صاف صاف طور پر لایا جائے۔ جو کتابیں اس مقصد کو مدنظر رکھتی معلوم ہوتی تھیں اُنہیں وہ کیناٹیکل ماننے کو تیار تھا۔

اب ایک بات اَور ہے جو غور کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ صرف اسی اصول کو کیناٹیکل خاصیت کے دریافت کرتے وقت کام میں نہیں لاتا تھا۔ یہ اُس کا آخری معیار تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک اور بات سے کام لیا کرتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اس آخری اور فیصلہ کن اصول کو ہر کتاب پر چسپاں نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ اسے صرف انہیں کتابوں کے متعلق کام میں لاتا تھا جو آگے ہی سے کیناٹیکل مشہور تھیں۔ اُس کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ اس اصول کو تمام مسیحی لٹریچر پر لگائے اور جس کتاب کا مرکز مسیح کو پائے

اُسی کو کینانیکل مان لے۔ یہ اُس کا مطلب نہ تھا۔ وہ اگسطن اور ٹالر صاحب کی تصنیفات کو کینانیکل نہیں مانتا تھا گو ان مصنفوں کی کتابوں کے طفیل سے اُس کو مسیحی نجات کی انمول برکتیں حاصل ہوئی تھیں۔ انہیں کے وسیلے سے اُس نے اطمینان دلی اور نورِ قلب اور قوت روح کو پایا تھا۔ باوجود اس کے وہ انہیں کینانیکل نہیں سمجھتا تھا۔ اور اسکی وجہ یہی تھی کہ وہ رسولی تصنیفات سے نہ تھیں۔ اس موقع پر یہ بھی کہنا واجب معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی کتاب اُسکے نزدیک رسولی ثابت ہوجاتی تو وہ اُسے کبھی رد نہ کرتا خواہ اُس کی بہت سی باتیں اُسکی رائے کے مطابق ہوتیں یا نہ ہوتیں۔ اور عملی واقعات شاہد ہیں کہ جن کتابوں کو وہ رسولوں کی تصنیف مانتا تھا اُن میں سے اُس نے ایک کو بھی رد نہیں کیا۔ اب اس بیان سے اظہر ہے کہ وہ اصول جسے ہم نے اُس کا آخری اور فیصلہ کن اصول کہا ہے درحقیقت ایک ایسا اصول تھا جو ایک اَور اصول کی کمی کو پورا کرتا تھا۔ یا یوں کہیں کہ ایک اور اصول بھی تھا جس نے کینانیکل کتابوں کے دائرے کو بہت محدود کر رکھا تھا اور لوتھر کا آخری اور فیصلہ کن اصول اسی محدود دائرے کے حدود کے اندر کام کیا کرتا تھا۔ اب سوال برپا ہوتا ہے کہ وہ عام اصول کیا تھا جس نے ان کتابوں کے دائرہ کو محدود کردیا تھا۔ وہ وہ قاعدہ تھا جسکے بموجب کلیسیا نے ابتدا میں نوشتوں کو جمع کیا تھا۔ لوتھر نے پہلے اس قاعدہ سے کام لیا۔ یعنی جو کتابیں کلیسیا نے نوشتوں کے مجموعہ میں داخل کردی تھیں اُس نے پہلے اُنکو لیا اور پھر اُنہیں میں سے ہر ایک کو اپنے معیار سے پرکھا۔ جو طریقہ اُس نے اختیار کیا وہ یہ تھا۔ پہلے اُس نے جیروم کی بائیبل کو لیا۔ اور اُس کے وسیلے سے اُن اُمیدواروں سے واقفیت پیدا کی جو کینن آف سکرپچر میں دخل پانے کا استحقاق جتلاتے تھے۔ زاں بعد اُن پر اپنا فیصلہ کن معیار چسپاں کیا۔ واضح ہو کہ جیروم کے زمانہ تک کلیسیا ان کتابوں میں سے بعض کے متعلق اشتباہ میں چلی آئی تھی اور لوتھر اس بات کو جانتا تھا پس وہ اپنے معیار سے صرف اُنہیں مشکوک کتابوں کے متعلق کام لیتا ہے۔ یعنی بڑی آزادی سے اُنہیں پرکھتا ہے کہ آیا وہ مسیح سے معمور ہیں یا نہیں۔ جن کتابوں کی اصلیت پر کلیسیا متفق تھی اُن کی نسبت

وہ ذرا چون وچرا نہیں کرتا *

اس سے ظاہر ہے کہ ایک شخص کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ لوتھر کینن کو کسی خاص زمانہ یا خاص اشخاص کی تصنیفات کا مجموعہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اُسے ایسی کتابوں کا مجموعہ تصور کرتا تھا جنکی علت غائی خدا کی نظر میں یہ تھی کہ بنی آدم کو ایک خاص قسم کی تعلیم دی جائے۔ پس اس مدعا کے مطابق یہ ضروری امر تھا کہ ہر جداگانہ تصنیف کی حقیقت پرکھنے کا معیار خود اُسی کی تعلیم میں پایا جائے۔ مگر جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں لوتھر نے اس اصول کو عملی طور پر فقط اُنہیں کتابوں پر چسپاں کیا جو شروع ہی سے رسولوں کی تصنیفات مانی گئی تھیں۔ اُس کی تحقیقات کی راہ میں یہ بڑی بڑی منزلیں نظر سے گزرتی ہیں۔ سب سے پہلے یعنی الہام اور الہامی کتابوں پر رائے قائم کرنے سے پہلے اُس نے مسیح کو قبول کیا۔ قبل ازیں کہ وہ نوشتوں کے بارے میں کسی طرح کی رائے کو اختیار کرے وہ مسیح پر ایمان لایا اور جب مسیح پر ایمان لاچکا تو اُس نے دیکھا کہ مسیح نے بعض اشخاص کو مقرر کیا ہے کہ اُس کی زندگی اور موت اور قیامت اور نزولِ روح کے بڑے بڑے واقعات پر گواہی دیں۔ اب اُسی ایمان نے جسکے وسیلے سے اُس نے مسیح کو سب سے اعلےٰ اور افضل جانا تھا۔ ہاں اُسی ایمان نے جس کی صداقت اُسکے نتیجوں سے آپ ہی آپ ثابت ہوجاتی ہے اُس کو مجبور کیا کہ اس بات کو تسلیم کرے کہ جو حکم مسیح نے رسولوں کو اپنے صعود سے پہلے دیا تھا وہ برحق ہے اور اس سے اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہی اُس پر اور اُس کی نجات پر گواہی دینے کے لئے اُس کے مقرر کردہ گواہ ہیں۔ اور محض انہیں کی تقلید کرنا واجب ہے۔ اب ہم پر بخوبی ظاہر ہوگیا کہ لوتھر انہیں رسولوں کی کتابوں کو قبول کرتا ہے مگر ایسی آزادی کے ساتھ کہ اگر اُن میں سے کوئی اُس بنیادی ایمان کے ذرا بھی خلاف ہوتی تھی جو وہ مسیح پر رکھتا تھا اور جس کے وسیلے سے اُس نے نئی زندگی پائی تھی تو وہ فوراً اُسے رد کرنے کو تیار ہوجاتا تھا۔ جن کتابوں کی تصنیف کا سوال مشکوک تھا اور جو شروع ہی سے کینن میں جگہ پانے کا دعوےٰ کرتی آئی تھیں وہ اُن کا فیصلہ اُن کی ذاتی خصوصیتوں کے مطابق کیا کرتا تھا۔ اگر وہ رسولی تعلیمات کے

ساتھ مطابقت رکھتی نظر آتی تھیں تو انہیں قبول کر لیا کرتا تھا اور اگر مطابقت نہیں رکھتی تھیں تو اُنہیں رد کر دیا کرتا تھا +

مگر اس میں یہ نقص نظر آتا ہے کہ اس اصول کے مطابق بہت کچھ فیصلہ آدمی کو آپ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی چاہتا تو لوتھر پر یہ اعتراض کر سکتا تھا "میں دیکھتا ہوں کہ یُوحنّا کی انجیل بہت سی باتوں میں پہلی تین انجیلوں سے مشابہت یا مطابقت نہیں رکھتی۔ سو جس طرح تم یعقوب کے خط کو اس بنا پر رد کرتے ہو کہ وہ پولوس کے خطوط سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میں بھی اُسی طرح یُوحنّا کی انجیل کو رد کرتا ہوں کیونکہ وہ پہلی تین انجیلوں سے مطابقت نہیں رکھتی" تو لوتھر اس اعتراض کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہ غالباً یہ کہتا کہ میری رائے میں بہتر یہی ہے کہ ہر ایک شخص نوشتوں کو اپنے اُس احساس کے مطابق قبول کرے جس احساس سے وہ اُنکی صداقت کو اپنے لئے آپ محسوس کرتا ہے کیونکہ یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ کسی خارجی سبب سے مجبور ہو کر انہیں قبول کرے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح وہ خود نڈر ہو کر اپنی رائے پیش کرتا ہے اُسی طرح بار بار اور صاف صاف طور پر اَوروں کی آزادی کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ وہ مکاشفات کی نسبت جسے خود قبول نہیں کرتا یوں رقم کرتا ہے "یہ بات ہر ایک شخص کی مرضی پر منحصر ہے کہ اگر چاہے تو اسے یُوحنّا کی تصنیف مانے اور اگر چاہے تو کسی اَور کی مانے۔ اُس کو کسی طرح اپنی آزادانہ رائے رکھنے سے رُکنا نہیں چاہیئے" اسی طرح یعقوب کے خط پر اپنی رائے پیش کرنے کے بعد یہ الفاظ اضافہ کرتا ہے "میں تو اس خط کو انجیل کی خاص کتابوں میں شامل نہیں کر سکتا مگر میں کسی کو یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ اُسے اُن میں شامل نہ کرے یا اُس کی تعظیم کرنا چھوڑ دے" اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہم اُن آرا میں جو اُس نے بعض کتابوں کی نسبت قائم کی ہیں اُس سے متفق نہ ہوں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ وہ خود جانتا تھا کہ اس قسم کے تخالف پیدا ہونگے۔ اور نہ ہی اُسکے اصول پر اس قیاس سے کہ اُسکے استعمال سے متخالف نتائج پیدا ہوتے ہیں کسی طرح کا حرف آتا ہے +

اب جو دھندلاپن کینن کے مسئلہ کے متعلق لوتھر کی تعلیم میں پایا جاتا ہے وہی کالون کے خیالات میں نظر آتا ہے۔ وہ اندرونی شہادت کا قائل ہے۔ مگر باطنی گواہی بھی اس کام کے لئے کافی نہیں کہ اُس سے ہر لفظ کی جو خدا کے مُنہ سے نکلا ہے تصدیق ہو۔ اسی بات کو دوسری صورت میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ باطنی گواہی بھی اکیلی کینن کے سوال کے حل کرنے کے لئے فیصلہ کن معیار نہیں ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ کالوے نسٹک مصنفوں کے خیال میں کچھ گڑبڑی آگئی تھی جو اس بات سے پیدا ہوئی تھی کہ وہ جب نوشتوں کے اختیار کے متعلق بات چیت کیا کرتے تھے تو سارے نوشتوں کو گویا ایک ہی نوشتہ سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ جب رومن کاتھولک اُن سے پوچھتے تھے تم کس طرح جانتے ہو کہ بائبل من جانب اللہ ہے؟ تو وہ یہ جواب دیا کرتے تھے۔ ہم اُسے اس لئے من جانب اللہ مانتے ہیں کہ خدا کی روح ہمارے اندر گواہی دے رہی ہے کہ وہ اُسی کا کلام ہے۔ مگر یہ اندرونی گواہی بائبل کے نوشتوں کے کینانیکل ہونے کا معیار صرف اُسی وقت قرار دی جاسکتی ہے جبکہ بائبل ایک ایسی واحد کتاب ہو جس کے حصص میں تقسیم نہ ہوسکے یعنی اُس کا ہر ایک حصّہ دوسرے حصّے سے ایسا مربوط ہو کہ ایک حصّہ کے ساقط ہونے سے دوسرا حصّہ بھی گرجاے اور اُس کے قائم رہنے سے دوسرا بھی اُس کے ساتھ قائم رہے۔

اب اگر بائبل کی تمام تصنیفات کو کینانیکل ثابت کرنے کے لئے یہ کہنا کافی ہوتا کہ خدا کی روح جو مجھ میں پائی جاتی ہے بائبل کو بطور ایک واحد کتاب کے خدا کا کلام محسوس کرتی ہے تو یہ دعوے کافی ہوتا۔ اسی طرح اگر یعقوب کے خط کے کینانیکل ہونے کو ثابت کرنے کے لئے صرف یہ کہنا کافی ہوتا کہ میں یعقوب کے خط میں خدا کی آواز کو محسوس کرتا ہوں تو اس حالت میں روح کی یہ باطنی شہادت کافی ہوتی مگر جس بات کی تلاش میں ہم لگے ہوئے ہیں وہ تو ہے ہی یہی کہ یہ مختلف حصّے کیونکر ایک کُل میں جمع کئے گئے؟ یا یوں کہیں کہ وہ اصول کیا تھا جس کی بنا پر کلیسیا نے ایک کتاب کو یہاں سے اور ایک کتاب کو وہاں سے لیا اور یوں ساری کتابوں کو جمع کرکے ایک کتاب بنالی۔ پس سوال اصل یہ ہے کہ وہ کونسا خاصّہ یا نشان ہے جو ہر ایک حصّہ

میں پایا جاتا ہے جس کے سبب سے مختلف حصص اُس وقت جبکہ جُدا جُدا کھنڈ ٹے پڑے تھے کینانیکل نوشتوں کے اجزا سمجھے گئے۔ ہاں جو سوال حل طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہم کس اُصول سے اس یا اُس کتاب کو کینن میں داخل کرتے ہیں؟ بحث اس بات پر نہیں ہے کہ ہمارے پاس خدا کا کلام ہے یا نہیں ہے۔ اور نہ اُس عام مجموعہ پر بحث ہے جس میں ہم اُس کلام کو پاتے ہیں۔ بحث اس بات پر ہے کہ ہم یہ کس طرح جانتے ہیں کہ عبرانیوں کا خط یا یہوداکا خط یا کوئی اَور کتاب خدا کا کلام ہے ؟

ویسٹ منسٹر کنفیشن (اقرارنامہ) الہام کو کینانسٹی (مجموعہ صحف میں کسی کتاب کو داخل کرنا) کا معیار قرار دیتا ہے۔ گو صاف صاف لفظوں میں اس بات کا بیان نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ پُرانے اور نئے عہدنامہ کی کتابوں کے نام رقم کرنے کے بعد وہ یوں کہتا ہے " یہ سب جو خدا کے الہام سے دی گئی ہیں"۔ اور تیسری دفعہ میں یہ لکھا ہے " وہ کتابیں جو عموماً اپاکرافا کہلاتی ہیں چونکہ خدا کے الہام سے نہیں لکھی گئی ہیں اس لئے کینن آف سکرپچر کا حصہ نہیں ہیں"۔ اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کتابیں الہامی ہیں وہ کینانیکل ہیں اور جو الہامی نہیں ہیں وہ کینانیکل نہیں ہیں۔ مگر اصل سوال تو پھر بھی بنا رہا اور وہ یہ کہ ہم کس طرح دریافت کریں کہ فلاں کتابیں الہامی ہیں ؟ عجیب بات ہے کہ یہ کنفیشن نہ تو کچھ نبیوں کی کتابوں کی بابت اور نہ ہی رسولوں کی تصنیفات کے متعلق کچھ لکھتا ہے۔ بلکہ ہماری توجہ اُن الٰہی نشانوں اور علامتوں کی طرف راجع کرتا ہے جو ان کتابوں کے اندر موجود ہیں۔ اور پھر اس کے بعد اس بحث کو ان لفظوں سے ختم کردیتا ہے "نوشتوں کی بے عیب صداقت اور اُن کے الٰہی اختیار کے متعلق ہمارا یقین اور ایمان اُس روح کے باطنی کام پر مبنی ہے جو ہمارے دلوں میں کلام کے وسیلے اور کلام کے ساتھ گواہی دیتی ہے "۔

اب صرف دو ہی طریق ایسے ہیں جن کے وسیلے سے ہم یہ دریافت کرسکتے ہیں کہ فلاں کتاب الہامی ہے یا نہیں۔ پہلا طریق یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی کتاب

کو پڑھکر اُس کی نسبت ایک راے قائم کرتے ہیں کہ آیا وہ حماقت کی پُڑیا ہے یا کسی لائق شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح ہم کسی الہامی شخص کی کتاب کو پڑھکر اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اُس کا لکھنے والا ہدایت الٰہی سے بہرہ ور تھا۔ یعنی اُس کتاب کا مضمون ہی ایسا ہوگا کہ ہم اُس سے دوچار ہوتے ہی محسوس کرنے لگ جائینگے کہ ہم ایک ایسی کتاب پڑھ رہے ہیں جس کا مصنّف خدا بھی ہے اور انسان بھی ہے۔ دوسرا طریقہ کسی کتاب کے الہامی ماننے کا یہ ہے کہ ہم مسیح پر ایمان لانے کے سبب سے اس بات کو مانیں کہ اُس نے بعض اشخاص کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اُس کے نام اور اختیار اور روح سے کلام کریں۔ اور جب ایسے لوگوں کی کتابیں جن کی اصلیت میں کسی طرح کا احتمال نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاتھ میں آتی ہیں تو ہم بشرطیکہ ہم مسیحی ہوں اُنہیں قبول کر لیتے ہیں کہ وہ الہامی ہیں ؀

لیکن بائیبل میں تو ایسی کتابیں بھی پائی جاتی ہیں جن کا الہامی ہونا ان طریقوں میں سے کسی طریقہ سے بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔ ہاں بائیبل میں ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی نبی یا رسول یا کسی اور مقرر کئے ہوئے شخص کی لکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً پہلی اور دوسری تواریخ۔ آستر۔ ایوب اور واعظ۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان کتابوں کو کس نے لکھا۔ پس الہام کی تحقیق کا ایک طریقہ تو ان کتابوں کے متعلق بیکار ہوگیا۔ باقی رہا دوسرا طریقہ یعنی باطنی گواہی کا طریقہ۔ اُس کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر آستر کی کتاب جان اوون کو بھی کینن کے باہر پڑی ہوئی ملتی تو وہ بھی نہ جان سکتا کہ وہ الہامی ہے۔ پس ہم آستر جیسی کتاب کا کینن میں شامل کیا جانا کس بنا پر برحق مانیں۔ کیونکہ نہ اس کتاب کا مصنّف ہی معلوم ہے اور نہ اُس کے الہام کے بارے میں اندرونی گواہی ہی بڑی صاف شہادت پیش کرتی ہے ؀

اب یہ کہنا کہ ہم آستر کی کتاب کو اس لئے قبول کرتے ہیں کہ یہودیوں نے اُسے قبول کر لیا تھا وہی بات ہے جو رومن کیتھولک ملنتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ہم کتب الہامی کے مجموعہ کو فقط کلیسیا کے ہاتھ سے لیتے اور اُسی کے حکم سے قبول

کرتے ہیں۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ جن بزرگوں نے ان کتابوں کے مجموعہ کو مرتب کیا وہ ملہم تھے تو ہم ایک ایسے دعوے کو پیش کرتے ہیں جسے پایۂ ثبوت تک پہنچانا بڑا مشکل کام ہے۔ ہماری رائے میں ایسا دعوےٰ کرنا ایک لغویات کو پیش کرنا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ پرانے عہدنامہ کے کینن کے متعلق ۱۸۹۶ء تک بحث کا بازار گرم رہا۔ پس ہم اس قسم کی کتابوں کا صحف انبیا میں شمار کیا جانا کچھ کچھ اُسی بنا پر درست مان سکتے ہیں جو بنا لوتھر نے پیش کی تھی۔ اور وہ یہ کہ اگر مکاشفہ کی اصل غرض کے ساتھ ان کتابوں کی مطابقت ہو تو ہم اُنہیں قبول کرینگے ورنہ رد کر دینگے۔ اگر کیننیکل کتابوں سے ہماری مراد ایسی کتابیں ہیں جن کے وسیلے سے خدا ہمیں اُس کشف کا علم بخشتا ہے جو اُس نے مسیح میں مرحمت فرمایا ہے۔ ہاں اگر کیننیکل صحائف کی نسبت ہمارا یہی خیال ہو اور اگر ان کتابوں کا ایمان اور عمل کے لئے دستور العمل ہونا اس قیاس کا ایک لازمی نتیجہ سمجھا جائے تو کینن کی تدوین کے لئے ہمیں ایک وسیع اصول دستیاب ہو جاتا ہے اور ہم اُس میں ایسی سب کتابیں جو کیننیکل ہونے کا دعوےٰ لیکر ہمارے پاس آتی ہیں شامل کر سکتے ہیں بشرطیکہ اُن کا تعلق خدا کے اُس مکاشفہ کے ساتھ جو مسیح میں بخشا گیا ہے صاف صاف طور پر نظر آئے۔ اگر کوئی کتاب اس مکاشفہ کے تاریخی تسلسل میں کڑی کی طرح لگی ہوئی ہے۔ اور اگر وہ کوئی ایسا خاص موقع ہماری آنکھوں کے سامنے لاتی ہے جس میں خدا کے عجائب کام جو اُس نے اپنے بندوں کے لئے کئے مشاہدے سے گزرتے ہیں۔ یا وہ ترقی نظر آتی ہے جو اُس کے بندوں نے اُن عجائب کاموں کے بعد کی۔ اور اگر اُس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو الہام کے تصور سے نامطابقت رکھتی ہو تو وہ کتاب کینن آف سکرپچر میں داخل کی جا سکتی ہے یعنی اُس کا کینن میں داخل ہونے کا دعوے قبول کیا جا سکتا ہے۔ پس ہم یہ کہنے کو تیار ہیں کہ دو باتیں ہیں جن کے سبب سے کوئی کتاب کینن میں داخل ہونے کے قابل سمجھی جا سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ اوّل۔ اُس کا مکاشفہ کے اصل مقصد کے ساتھ مطابقت رکھنا۔ دوم اُس تعلق کا خدا کے مکاشفہ کے تاریخی اظہار میں تاریخی تعلق کی صورت میں صاف

صاف نظر آتا ۔

اب معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر آستر جیسی کتاب کھوئی جائے تو کوئی لازمی جزو کتاب مقدس کا تلف نہ ہوگا۔ یا اگر چند زبور گم ہو جائیں تو اس سے بھی کوئی بڑا ضروری حصہ کھویا نہیں جائیگا۔ لیکن ایسا دعوےٰ کرنا گویا یہ کہنا ہے کہ اگر کسی آدمی کی انگلی کا کوئی جوڑ جاتا رہے یا پاؤں کا انگوٹھا کٹ جائے تو اس کا کوئی ضروری حصہ ضائع نہیں ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا آدمی جی سکتا ہے اور اپنا کام بھی کر سکتا ہے مگر اُس کا بدن سالم یا کامل نہ رہا۔ جسم کے بہت سے حصے ایسے ہیں جنکی نسبت یہ بتانا کہ وہ کیوں اپنی اپنی جگہ پر لگائے گئے ہیں مشکل کام ہے۔ اور نہ ہم اُن کی بابت یہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیوں ایسے ہیں جیسے کہ وہ ہیں۔ تاہم یہ صاف ظاہر ہے کہ خدا نے انہیں اُن کی جگہ پر لگایا۔ اور اُن کا وہاں نہ ہونا جسم کی کجی پر دلالت کرتا ہے۔ یہی حال بائبل کا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم یہ نہ بتا سکیں کہ فلاں فلاں خاص حصے کا کل کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ صدق دلی سے ہمارا یہ خیال ہو کہ اگر فلاں فلاں ٹکڑا اُس میں سے نکل جائے تو اس میں کوئی نمایاں نقص پیدا نہیں ہوگا تاہم یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں اس کینن میں اضافہ کرکے اسے زیادہ عمدہ بنا سکتا ہوں۔ یا فضول حصوں کو نکال کر اس کو بہتر صورت میں لا سکتا ہوں وہ بڑا کوتہ اندیش اور جلد باز آدمی ہے ۔

اب اس ساری بحث سے ذیل کے خیالات جمع کئے جا سکتے ہیں۔ (۱) جب کلیسیائیں اس مضمون پر بحث کریں تو انہیں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ کبھی ایسا دعویٰ نہیں کرنا چاہئے جس سے یہ ظاہر ہو کہ کینن آف سکرپچر ایسی کتابوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر ایک کی نسبت کلی فیصلہ ہو چکا ہے کہ اُسکی نسبت ہر ذرا ذرا سی بات پورے پورے طور پر دریافت ہو چکی ہے۔ اور یہ کہ چھان بین ایسے صاف صاف اصولوں پر مبنی ہے کہ وہ کتاب غیر کینانیکل صحائف سے ہر طرح امتیاز کی جا سکتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ نئے عہد نامہ کی بہت سی کتابیں ہمارے پاس ایسی عالمگیر شہادت اور گواہی کے ساتھ آئی ہیں کہ انہیں رد کرنا گویا مسیح کے اختیار کو رد کرنا

ہے۔ مگر چند ایسی بھی ہیں جن کی نسبت ایسا کلی اتفاق قدیم زمانہ میں نہ تھا۔ پس ہمیں اِس بات کے ماننے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ بہت سی کتابیں کینن میں ایسی ہیں جو عالمگیر اتحاد سے قبول کی گئیں۔ مگر نئے عہدنامہ کی سات کتابوں کی نسبت کسی قدر شک و شبہ نے قدماء کے خیال میں راہ پائی۔ ہماری رائے میں چلنگ ورتھ کا خیال جو پراٹسٹنٹزم کا بڑا معاون سمجھا جاتا ہے غور کے قابل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "میں اُن متنازعہ فیہ کتابوں کو بھی رسولوں کی تصنیف اور کینانیکل مان سکتا ہوں۔ مگر میں یہ دعوےٰ اُنکی نسبت ایسی پختگی کے ساتھ نہیں کرسکتا جیسی پختگی کے ساتھ اُن کتابوں کی نسبت کرسکتا ہوں جن پر کسی طرح کا اعتراض کبھی نہیں ہوا ہے۔ پس میں کسی شخص پر جو اُن پر شک لاتا ہے یا اُنہیں قبول نہیں کرتا ہے فتویٰ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میرے سامنے اُن بزرگوں کا نمونہ ہے جو آسمانی آرام میں داخل ہوگئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر چاہوں تو شک کرنے والوں کے شک اور انکار کرنے والوں کے انکار کو مناسب سمجھوں۔ اور اگر چاہوں تو اُس سے درگزر کروں"۔ یہی خیال لوتھر اور دیگر مصلحوں کا تھا اور ہماری دانست میں یہ افسوس کی بات ہے کہ لوگوں نے اس خیال کو اب ترک کردیا ہے۔ یہ تو کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جس کے سبب سے ہمیں نوحہ کرنا چاہئے بلکہ برعکس اس کے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کم معتبر کتابوں کو اُن کتابوں کے ساتھ ملا دینے سے جو پُورے پورے طور پر معتبر سمجھی گئی ہیں یہ نتیجہ پیدا ہوگیا ہے کہ جو لوگ معتبر کتابوں کی تاریخ سے ناواقف ہیں وہ اُن کو بھی ناقابل اعتبار سمجھنے لگ گئے ہیں ؎

پھر ہم یہ بھی سیکھتے ہیں کہ عام پراٹسٹنٹ لوگوں کو کینن کے سوال کے متعلق کونسا پہلو اختیار کرنا چاہیئے۔ بعض اوقات رومن کیتھولک لوگ بڑی نادانی سے ہم پر طعن کرکے کہا کرتے ہیں کہ ہر ایک پراٹسٹنٹ کو خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا نہ ہو کینن کا فیصلہ اپنے لئے آپ کرنا چاہیئے۔ یہ طعن ایک خام خیالی پر مبنی ہے۔ بیشک یہ تو ضرور ہر ایک پراٹسٹنٹ کا حق ہے کہ وہ اُن دلائل کو آزمائے جن کی بنا پر ہماری کتابیں کینانیکل قبول کی گئی ہیں۔ اور جس قدر زیادہ لوگ اس حق کو کام

مین لائیں اسی قدر اچھا ہے۔ پر اگر یہ حق استعمال نہ کیا جاوے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انہوں نے اپنے حق کو ترک کر دیا ہے۔ پراٹسٹنٹ لوگ کینن کو اسی طرح قبول کرتے ہیں جنہوں نے تحقیقات کے مرحلوں کو طے کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم نے سکندر کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی گواہیوں پر خود کبھی غور نہیں کیا ہے۔ تو بھی ہم اس واقعہ کو اُن لوگوں کی شہادت پر جو تواریخی واقعات سے بخوبی واقف ہیں قبول کرتے ہیں۔ اب کیا اس سے ہمارا وہ حق جو ہم تواریخی واقعات کی چھان بین کے متعلق رکھتے ہیں ہم سے چھن جاتا ہے۔ نہیں۔ کیونکہ اگر ضرورت ہو تو ہم اسے کام میں لاسکتے ہیں۔ اسی طرح کینن کے متعلق بھی عام لوگ اصلاح یافتہ کلیسیاؤں کے فیصلہ کو قبول کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کو اس بات کا یقین ہے کہ اُن مباحثوں اور تحقیقات کے بعد جن میں علماء کو مصروف ہونا پڑا جو نتائج برآمد ہوئے وہ مغالطہ وہ نہیں ہیں مگر اسکے ساتھ ہی وہ اس حق کو بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کہ اگر ضرورت ہو تو خود اس مضمون کی تحقیق کریں۔ اور نہ وہ ایک لمحہ کے لئے یہ خیال کرتے ہیں کہ کلیسیا کا فیصلہ ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم بعض کتابوں کو ضرور من عند اللہ سمجھیں۔ پس جب کوئی پراٹسٹنٹ کلیسیا کا فیصلہ قبول کرتا ہے تو وہ اُسی طرح کرتا ہے جس طرح کہ وہ انجنیروں اور ڈاکٹروں اور دیگر اشخاص کا فیصلہ قبول کر لیتا ہے جو اپنے اپنے کام میں ماہر سمجھے جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مانتا ہے کہ یہ فیصلہ لائق اور قابل اشخاص کے بہت سے غور و فکر کے بعد کیا گیا ہے۔ مگر رومن کیتھولک اپنی کلیسیا کے فیصلہ کو بمنزلہ ایک حکم یا ایک قانون کے سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ وضع ہی اسی واسطے کیا گیا ہے کہ کلیسیا چاہتی ہے کہ وہ مانا جاوے۔ پس رومن کیتھولک اُسے علما کی تحقیق کا نتیجہ سمجھکر قبول نہیں کرتا۔ اُس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کلیسیا کے فیصلہ کی نکتہ چینی کرے۔ اُس کا اعتقاد یہ ہے کہ کلیسیا کو اختیار ہے کہ جس کتاب کو چاہے کینانیکل بنائے۔ مگر برعکس اس کے پراٹسٹنٹ یہ مانتا ہے کہ قطع نظر کلیسیا کے فیصلہ کے ہر ایک کینانیکل کتاب کے اندر وہ کچھ پایا جاتا ہے جسکے سبب سے وہ کینانیکل ہونے کا استحقاق رکھتی ہے۔ ان دو واضح اور بین باتوں کو آپس میں

خلط ملط کر دینا یا تو جہالت پر دلالت کرتا ہے اور یا بغض پر ۔

(۳) پھر وہ طنزاً ہمیں یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ دیکھو ہر شخص کو اختیار دینے سے کیسا بُرا نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ لوگ کبھی آپس میں متحد نہیں ہوتے بلکہ الہامی کتابوں کی نسبت طرح طرح کی مختلف آرا رکھتے ہیں ۔ ہم اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس قسم کے معاملات کو ہر ایک کی تحقیق کے لئے کھلا چھوڑ دینے سے بہت فوائد منتج ہوتے ہیں ۔ کیونکہ اس سے تحقیق کرنے کی عادت کو اشتعال دیا جاتا ہے اور اس اشتعال کا نتیجہ یقیناً ایک دن یہ ہوگا کہ سچائی دنیا کی آنکھوں کے سامنے آپ ہی آپ روشن ہو جائیگی ۔ بھلا اُس اتحاد سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے جو لوگوں کی آنکھیں اور مُنہ بند کر کے وجود میں لایا جاتا ہے ؟ وہی اتحاد فائدہ مند ہے جسے سچائی خود پیدا کرتی ہے ۔ اور یہ اتحاد فقط ایک پُرجوش اور پُرتعظیم اور سچائی کی تلاش کرنے والی تحقیق سے پیدا ہوتا ہے ۔ ہماری رائے میں لوتھر کا یہ خیال صحیح تھا کہ بعض کتابوں کی نسبت تو اختلاف آرا ہمیشہ قائم رہیگا ۔ لیکن نئے عہد نامہ کا بہت سا حصہ ۔ یعنی اناجیل اور اعمال کی کتاب اور پولوس رسول کے خطوط اور مقدس پطرس کا پہلا خط اور مقدس یُوحنا کا پہلا خط ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت آخرکار کسی طرح کا اختلاف نہیں رہیگا جیسا کہ قدیم کلیسیا کے زمانہ میں نہ تھا ۔ لوگ شیکسپیر کی کتاب موسومہ ہیملٹ کی تصنیف کے بارے میں کسی طرح کی حجت نہیں کرتے اور نہ اُس قدر و منزلت پر چون و چرا کرتے ہیں جو اس کتاب کو حاصل ہے ۔ اب یہی حال کینانیکل کتابوں کا ہوگا ۔ یعنی لوگوں کی شخصی رائے اور نکتہ چینی کرنے کی آزادی سے ان کتابوں کے متعلق لوگوں کے درمیان اختلاف رائے پیدا نہیں ہوگا بلکہ جتنا اب موجود ہے وہ بھی دُور ہو جائیگا اور لوگوں کی رہنمائی حقیقی اتحاد کی طرف کی جائیگی ۔

(۴) آخری بات قابل غور یہ ہے کہ صحیح پراٹسٹنٹ ترتیب یہ ہے ۔ پہلے مسیح پر ایمان ۔ بعد ازاں کلام پر ایمان ۔ ہمارا ایمان جو مسیح پر ہے وہ ہمارے نوشتوں کے ایمان پر مبنی نہیں ۔ بلکہ برعکس اس کے ہمارا نوشتوں کو ماننے والا ایمان ہمارے اُس ایمان پر قائم ہے جو ہم مسیح پر رکھتے ہیں ۔ بے شک ہمارا وہ ایمان جو ہم مسیح پر

رکھتے ہیں نوشتوں پر بحیثیت سچّی تاریخ ہونے کے قائم ہوسکتا ہے۔ نہ کہ اس اعتبار سے کہ وہ الہامی یا کینانیکل ہیں۔ وہ جو ایمان کو پیدا کرتا ہے مسیح ہے خواہ وہ ایمان نوشتوں کی تلاوت سے پیدا ہو۔ خواہ منادی کے وسیلے سے پیدا ہو یہی قدیم زمانہ میں ہوا اور یہی اب ہوتا ہے۔ وہی شخص سچّا پراٹسٹنٹ ہے جو یہ جانتا ہے کہ خدا مجھ سے مسیح میں بولا اور کہ یہ بات کسی کلیسیا کے مبرّا عَن الخطا فیصلے پر قائم نہیں اور نہ نوشتوں کے اختیار پر مبنی ہے۔ ہمیں مسیح کے اعلےٰ اور آخری اختیار کو اُس سے لیکر نوشتوں کو نہیں دینا چاہیئے +

تیسرا باب

مکاشفہ

اگر بائیبل خدا کا کلام ہے۔ اگر وہ اُس مکاشفہ کا جو خدا نے اپنی ذات وصفات کے مُتعلّق ظاہر فرمایا ہے ایک وسیلہ اور لکھا ہوا بیان ہے تو یہ نتیجہ منتج ہوتا ہے کہ جس قدر ہم لفظ مکاشفہ کا مطلب زیادہ دریافت کریں اُسی قدر ہم بائیبل کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکینگے۔ یہ مضمون ایک ایسا مضمون ہے جسے طرح طرح کے مباحثوں نے نہایت مشکل اور سخت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ مگر شکر ہے کہ اس پر اب زیادہ زیادہ روشنی رفتہ رفتہ گرتی ہے۔ اس وقت ہم جہاں تک ممکن ہوگا غیرضروری بحث کی اُلجھنوں سے بچکر مفصلۂ ذیل باتوں پر غور کرینگے (۱) مکاشفہ کا کیا مطلب ہے۔ (۲) کیا مکاشفہ ممکن ہے (۳) کیا کبھی خدا نے اپنے مکاشفہ سے اپنے بندوں کو ممتاز فرمایا ہے۔ اگر اس قسم کا مکاشفہ بخشا گیا ہے تو کہاں ہے۔ (۴) کس طریقہ سے وہ مکاشفہ بخشا گیا ہے۔ اور (۵) کس غرض یا مقصد کو پُورا کرنے کے لئے بخشا گیا ہے +

اوّل ہمیں یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ جب ہم اس لفظ مکاشفہ کو استعمال

کرتے ہیں تو کس معنی میں استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ لفظ مکاشفہ (Revelation)
انگریزی زبان میں مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض وقت اس سے
یہ مراد ہوتی ہے کہ خدا بلا وساطت کسی خارجی وسیلے کے اپنی صداقت اپنے
رسول کے دل پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اسکی مثال پولوس رسول کا وہ قول ہے جس سے
یہ دعوےٰ ٹپکتا ہے کہ اُس نے اپنی انجیل یسوع مسیح کے مکاشفہ کے وسیلے
پائی تھی۔ بعض اوقات اس لفظ کا اطلاق کسی ایسے خارجی ظہور یا واقعہ پر
بھی ہوتا ہے جسکے وسیلے سے خدا کا پیغام یا سچائی دل پر منکشف کی جاتی ہے
اسی معنی میں طوفان کو خدا کی راستی کا ظہور یا مکاشفہ کہا ہے۔ بعض اوقات
اس کا اطلاق خاص اُس سچائی پر ہوتا ہے جو منکشف کی جاتی ہے۔ اٹھارھویں
صدی میں نیچر اور مکاشفہ کے مذہب میں جو امتیاز کیا جاتا تھا اُسکے سبب سے
ایک خاص قسم کے معنے اس لفظ پر چسپاں ہو گئے تھے۔ یعنی اس سے وہ عرفانِ
الٰہی مراد لیا جاتا تھا جو نیچر کے وسیلے سے نہیں بلکہ فقط خدا کے کسی فوق العادت
فعل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ بٹلر صاحب فرماتے ہیں "بعض یہ کہکر
کہ نیچر سے جو روشنی دستیاب ہوتی ہے وہ کافی و وافی ہے ہر طرح کے مکاشفہ
کو قصداً ترک کر دیتے ہیں گویا کہ مکاشفہ بذاتہ ناقابل الیقین ہے یا یوں کہیں کہ
وہ ایک ایسی شے ہے جو کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ پر یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر
نیچر کی روشنی اس قدر کافی ہوتی کہ مکاشفہ کی ضرورت نہ رہتی یا اُس کا دیا جانا
فضول ثابت ہوتا تو کوئی مکاشفہ نہ دیا جاتا" اب یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ
مکاشفہ کرسچینٹی (مسیحیت) اور یہودی مذہب کا جو مسیحی مذہب کا گویا ایک
دیباچہ تھا مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یوں اس لفظ کو بائبل پر چسپاں کرکے اس سے
یہ مراد لی ہے کہ گویا بائبل میں مکاشفہ الٰہی کی جڑ اور تاریخ قلمبند ہے۔ لیکن
اس سے اصل خیال میں کسی قدر گڑبڑی پڑ جاتی ہے۔

ہماری رائے میں اس لفظ کا یہ استعمال بہت وسیع نہیں ہے۔ کیونکہ
اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے تئیں اُن لوگوں پر جو حلقۂ عیسویت سے

باہر ہیں ظاہر نہیں کیا یا یوں کہیں کہ اُس نے اپنے تئیں خلقت میں ظاہر نہیں کیا کہ سوائے یہودی اور مسیحی حلقوں کے اُس نے اور سب مسیحی حلقوں میں اپنے آپ کو بغیر گواہ کے چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے خیال میں وہ فرق جو مسیحی دین اور دیگر ادیان میں پایا جاتا ہے زیادہ اچھی طرح سے ظاہر ہو اگر ہم مسیحی دین کو کامل مکاشفہ اور دوسرے ادیان کو ناکامل مکاشفہ کہیں۔ انگریزی الفاظ ریویلڈ Revealed (وہ جو ظاہر کیا گیا ہے) اور نیچرل سے یہ فرق صفائی سے ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر ایک مذہب کی تہ میں خدا کا کچھ نہ کچھ ظہور یا علم موجود ہوتا ہے خواہ وہ علم خفیف ہی سا کیوں نہ ہو۔ اور وہ علم فقط اُسی خدا کی طرف سے ملتا ہے جو اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح سے اُس مذہب کے ماننے والوں پر ظاہر کر چکا ہے۔ پاسکل صاحب کے الفاظ نہایت پُر مطلب اور پُر صداقت ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا خدا فرماتا ہے کہ "تو مجھے ہرگز نہ ڈھونڈتا اگر تو نے ڈھونڈنے سے پہلے مجھے نہ پایا ہوتا" پس خدا کے وہ تمام تصورات جو مختلف اقوام میں پائے جاتے ہیں گویا اس بات کی گواہی ہیں کہ خدا کسی نہ کسی صورت میں اپنے تئیں اُن اقوام پر ظاہر کرتا رہا ہے۔ پس لازم ہے کہ لفظ مکاشفہ کو اُسکے پورے اور ٹھیک معنے دئے جائیں۔ جن سے ظاہر ہو کہ خدا نے اپنے تئیں انسان پر ظاہر کر دیا ہے خواہ اُسکا یہ کشف انتظام فطرت کے وسیلے ہوا ہو خواہ فوق العادت اظہارات کے وسیلے ہوا ہو۔ خواہ وہ قائل کرنے والی صفائی کی بینات کے ساتھ ہوا ہو خواہ خدا کی حضوری کے دُھندلے ظہوروں کے ساتھ ہوا ہو *

اٹھارھویں صدی میں ایک اور غلط تصور متعلق مکاشفہ کے پایا جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ مکاشفہ سے مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ بعض صداقتیں انسان کے ذہن پر ظاہر کر دی جائیں اور بس۔ اس میں شک نہیں کہ الٰہی صداقتیں مکاشفہ کے وسیلے ظاہر کی جاتی ہیں۔ لیکن سترھویں صدی میں بائبل ڈاگما (عقیدے یا مسائل) کے ثابت کرنے کے لئے اسیقدر ٹکسٹ بک (Text book)

کے طور پر استعمال کی جاتی تھی کہ لوگ یہ سمجھنے لگ گئے تھے کہ بائیبل کا کام ہی صرف یہی ہے۔ اور کبھی یہ دریافت نہیں کرتے تھے کہ آیا کوئی اَور اعلےٰ اور بہتر مقصد بھی ہے جسے بائیبل پورا کر سکتی ہے۔ لوگ بائیبل اور الہام دونوں کو ایک ہی بات سمجھتے تھے۔ اور یہ فرض کر بیٹھے تھے کہ مکاشفہ کا مقصد فقط یہی ہے کہ صرف سچائی (یعنی دینی مسائل یا عقائد) اُس سے ظاہر ہوں حالانکہ مکاشفہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ خدا کو ظاہر کرے۔ لوگوں کے درمیان مکاشفہ کی ضرورت کی بابت اور نیز اُن باتوں کی نسبت جن کا مذکور اُس میں پایا جاتا ہے بہت ہی اختلاف رائے دیکھنے میں آتا تھا۔ بعض لوگوں کا گمان تھا کہ بائیبل میں ہر طرح کا علم ملتا ہے کہ ہر طرح کے سائنس اور علم مابعد الطبیعت کے راز اُس کے صفحات میں نہاں ہیں۔ بائیبل کی ہر بات خواہ وہ کسی معاملہ کے متعلق کیوں نہ ہو الہام ہی سمجھی جاتی تھی۔ مثلاً کلووِی اُس کہا کرتا تھا کہ "کون کوپرنی کس کے اختیار کو خدا کے اختیار پر ترجیح دینے کی جرأت کر سکتا ہے"؟ بعض لوگ بائیبل کے معلمانہ کام کو محض اُن صداقتوں پر محدود کر دیتے تھے جو خدا اور بقا اور فرائض کے ساتھ علاقہ رکھتی ہیں۔ ویسٹ منسٹر شارٹر کیٹی کزم (سوال وجواب کی چھوٹی کتاب جو ویسٹ منسٹر میں تیار ہوئی) میں اس سوال کا کہ نوشتے خاصکر کیا سکھاتے ہیں؟ ذیل کا جواب دیا گیا ہے جو مطلب سے پُر ہے "نوشتے خاصکر وہ باتیں سکھاتے ہیں جو انسان کو خدا کی نسبت اور اُن فرائض کی نسبت ماننی چاہئیں جو خدا اُس سے طلب کرتا ہے"۔ اب اس سے بہتر کوئی جواب سوال مذکورہ بالا کو نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ان ایام میں نوشتوں کے متعلق یہ سوال سب سے مقدم یا سب سے ضروری نہیں سمجھا جاتا +

اگر ہم بائیبل پر بخوبی غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ بائیبل علم الٰہی کی کتاب نہیں ہے اور نہ وہ اس غرض کو اچھی طرح پورا کر سکتی ہے۔ انسان کی ساری تاریخ میں جو الٰہی مکاشفے یا اظہارات بخشے گئے ہیں اُن سے خدا کا یہ مقصد نہ تھا کہ انسان علامہ علم الٰہی بن جائے۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو بنی آدم پر آشکارا کرے

ہاں اُس کی غرض یہ نہ تھی کہ وہ ہمیں مشکل رازوں اور فعل مختار مرضی ۔ اور برگزیدگی اور آئندہ حالت کے بھیدوں سے کماحقہٗ طور پر آگاہ کردے ۔ اُسکی یہ غرض تھی کہ وہ ہمیں اپنی حضوری اور اپنی پاکیزگی اور اپنی محبت کی واقفیت سے مالا مال کرے پس بائیبل کوئی الہامی سوال وجواب کی کتاب نہیں ہے ۔ اور نہ وہ کسی تھیولوجیکل یعنی علم الٰہی کے عقیدے کا رسالہ ہے ۔ وہ اُن عظیم الشان باتوں کا ایک طومار ہے جن کے وسیلے سے خدا نے اپنے آپ کو بنی آدم پر ظاہر فرمایا ہے ۔ اور چونکہ یسوع مسیح خدا کا وہ کامل مکاشفہ ہے جو دیگر سب مکاشفات کو اپنے میں شامل رکھتا اور اُن سے بدرجہا بڑھکر ہے لہذا مناسب ہے کہ ہم بائیبل کو یا تو یسوع مسیح کی تیاری یا اُس کا مظہر اور شرح سمجھیں ۔

پس لفظ مکاشفہ بائیبل کا مترادف نہیں ہے ۔ اور اگرچہ اُسکا مطلب اظہارِ صداقت بھی ہوسکتا ہے ۔ اور لاریب وہ صداقت کو ظاہر کرتا ہے تاہم سب سے اول اور مقدم مطلب اُسکا یہ ہے کہ خدا اپنے آپ کو انسان پر ظاہر فرماتا ہے ۔

۲ ۔ مکاشفہ کا امکان ۔ مکاشفہ کے امکان پر بحث کرنا غیر ضروری امر ہے ۔ کیونکہ وہ لوگ جو خدا کی ہستی کے قائل ہیں وہ خواہ کسی فرقے کے کیوں نہ ہوں مکاشفہ کے امکان کا انکار نہیں کرسکتے ۔ وہ خدا کے قائل ہی اسی لئے ہیں کہ وہ دُنیا کی تہ میں ایک ایسی روح کو محسوس کرتے ہیں جو زندگی اور مقصد رکھتی ہے اُن کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ خدا ہر شے کے وسیلے جس سے ہم اس دُنیا میں مس رکھتے ہیں اپنے آپکو ظاہر کرتا ہے ۔ بے شک پولوس یہ کہتا ہے کہ دُنیا نے اپنی دانائی سے خدا کو نہ جانا ۔ مگر اس سے اُس کا یہ مطلب نہ تھا کہ دُنیا کو خدا کا کسی طرح کا علم بھی حاصل نہیں ہوا ہے اُس کا مطلب فقط یہ تھا کہ دُنیا نے اپنی حکمت سے خدا کا وہ کامل علم حاصل نہ کیا جو ہمیں مسیح میں دستیاب ہوتا ہے ۔ مگر میکس مولر دوسری طرف یہ کہتا ہے کہ یہودی اور مسیحی دین سے الگ بھی لوگوں نے خدا کا اعلیٰ تصور یا علم حاصل کیا ہے ۔ مگر یہ ایک ایسے شخص کا مبالغہ ہے جسکے دل میں ایک دل پسند مضمون کے مطالعہ کے سبب سے طرفداری پیدا ہوگئی ہے حقیقت حال یہی ہے کہ دنیا نے مسیح سے الگ ہوکر کبھی خدا کا اعلےٰ تصور حاصل نہیں کیا ۔

جو کچھ دُنیا نے خدا کی نسبت دریافت کیا ہے وہ صرف اتنی بات کا اقبال ہے کہ خدا موجود ہے اور دُنیا میں حاضر و ناظر ہے۔ ہاں تھی ازم فقط اس بات کے اقرار کا نام ہے کہ اس دُنیا میں ایک مقصد اور اُس مقصد کو تجویز کرنے والا اور اُسکو پُورا کرنے والا شخص موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ خدا نے اپنے آپ کو دُنیا اور انسان کی سرشت میں ایک طرح ظاہر کر دیا ہے۔ فطرت کے تمام اجزا کا باہمی تطابق دن بدن کھلتا جاتا ہے اور نیز یہ امر روز بروز روشن ہوتا جاتا ہے کہ نیچر کے تمام اجزا ایک ہی مقصد کو پُورا کرنے کی طرف مائل ہیں اور تمام معتقدانِ ہستیِ خدا اس بات کو مان رہے ہیں کہ فطرت کی اس باہمی مطابقت کا تسلی بخش حل صرف یہی ہو سکتا ہے کہ دُنیا میں ایک قسم کا **مقصد** مسلّط ہے۔ اور اسی طرح وہ جبلی اسرار جسکے سبب سے انسان باوجود طرح طرح کی رخنہ اندازیوں کے اخلاق کے ایک کامل نمونہ کا خیال کبھی نہیں چھوڑتا بلکہ اُسے ہمیشہ پکڑے رہتا اور اُسی کے مطابق عمل کرتا ہے اس بات پر دال ہے کہ انسان اپنے سے ایک افضل ہستی کا قائل ہے جس میں اُسے اخلاق کا کامل نمونہ نظر آتا ہے اور اُس نمونہ کو دیکھکر اُسے یہ یقین ہوتا ہے کہ میں بھی اس نمونہ کی مانند بن جاؤنگا۔ پس ان دو باتوں میں یعنی فطرت کی مطابقت اور ترقی میں اور انسان کے ایک کامل اخلاقی نمونہ کے تصور میں۔ ان دو باتوں میں خاص کر معتقدان ہستی خدا کو اس عقیدے کی کہ خدا نے اپنے تئیں انسان پر ظاہر فرمایا ہے ایک قاطع دلیل ملتی ہے ؛

برعکس اس کے خدا کے مکاشفے کے امکان کا انکار کرنا گویا مذہب کے امکان کا انکار کرنا ہے۔ یا مذہب کو ایک دھوکا سمجھنا ہے۔ پرنسپل فیربرن صاحب فرماتے ہیں کہ "مکاشفے کا تصور ہر مذہب کا ایک لازمی جزو ہے۔ جو شخص یہ نہیں مانتا کہ خدا اُس سے بول سکتا ہے وہ کبھی خود خدا سے نہیں بولیگا" خدا کی ہستی خواہ کیسی ہی پُر راز اور بعید الفہم کیوں نہ ہو اس میں شک نہیں کہ مذہب کا وجود کبھی قائم نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ یہ نہ مانا جائے کہ خدا ہے اور اُس نے اپنے آپ کو ظاہر فرمایا ہے۔ ماسوا اسکے یہ لازمی امر ہے کہ اُس خدا کی عبادت اور بندگی کسی نہ کسی

وقت بند ہو جو صُم بُکم ہو کر نہ تو انسان کی اُس آرزو کو آسودہ کرتا ہے جو رفاقت الٰہی
کی مشتاق ہے اور نہ اپنے عابد کی زندگی اور دل میں کلام یا کام کے وسیلے اپنی حضوری
کا احساس پیدا کرتا ہے۔ پروفسر ٹیل صاحب خوب فرماتے ہیں کہ" یہ بات ناممکن
اور دور از قیاس ہے کہ انسان اپنے خدا کے ساتھ اُس حالت میں رفاقت رکھ سکے
جبکہ اُسکی روح کی تمام دیندارانہ خواہشیں اور آرزوئیں اور دعائیں جو وہ مدد اور
ہدایت اور سہارے کے لئے کرتا ہے آخرالامر اس نتیجہ کو پہنچیں کہ" احمق کے سوائے
اور کوئی اپنی دعاؤں کے جواب کا انتظار نہیں کرتا" وہ دین جو ایک طرفہ دین ہے
(یعنی صرف انسان کی دینداری کا قائل ہے مگر خدا کی مدد اور رفاقت کا منکر) وہ
بالضرور اُس پل کی طرح گر جائیگا جو صرف ایک ستون پر کھڑا ہے۔ ذلیل سے ذلیل بت پرستی
بھی اس خیال سے خالی نہیں کہ اندیکھا خدا ایک مرضی رکھتا ہے اور اُس مرضی کو کسی نہ کسی
طرح ظاہر بھی کر سکتا ہے۔ اہل یونان جو صدائے غیب سے مشورت طلب کیا کرتے تھے
اور اہل روما جو غیبی نشانوں اور شگونوں کے منتظر رہتے تھے اس بات کے قائل تھے
کہ مذہب یکطرفہ معاملہ نہیں ہے۔ وہ اس بات کے معتقد تھے کہ جب انسان کسی راز
کا انکشاف طلب کرتا ہے تو ضرور ہے کہ خدا اُس کا جواب دے۔ اور واقعی یہ اعتقاد
کہ خدا اپنے آپ کو اپنی مرضی کو بنی آدم پر ظاہر کرنے کی طاقت اور خواہش رکھتا ہے
ایک کھرا اور سچا اعتقاد ہے*

ماسوائے اسکے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ناممکن نہیں ہے کہ وہ ارواح آپس میں
ہمکلام ہوں جو ایک دوسری سے ایسی صحبت اور قربت رکھتی ہیں اور ایسا علاقہ رکھتی ہیں
جیسا کہ خدا کی روح اور انسان کی روح میں پایا جاتا ہے۔ پفلیڈرر (Pfleiderer)
صاحب اپنی کتاب فلاسفی آف ریلجن میں کہتے ہیں کہ جب آدمی دوسرے آدمیوں کی
محبت بھری رفاقت کو حاصل کر سکتا ہے تو ہم کیوں کہیں کہ خدا ایسا نہیں کر سکتا۔
میری دانست میں وہ انسان کی نسبت اس رفاقت کی زیادہ قابلیت اور طاقت
رکھتا ہے۔ آدمی دوسرے آدمی کے دل کا حال کما حقہ نہیں جان سکتا۔ اسی واسطے
اُسکے دل میں پورے پورے طور پر جاگزیں نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری

محبت ناکامل ہے اور ناکامل رہتی ہے۔ ہم اب اپنی جداگانہ بشریت کی محدودیت کے سبب سے ایک دوسرے کے دل میں دخل نہیں پاتے ہیں۔ مگر خدا کے لئے یہ قید نہیں ہے کیونکہ اُس کے لئے ہم میں سے ہر ایک کا دل ایسا ہی کھلا ہے جیسا کہ وہ ہمارے لئے کھلا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کو پورے پورے طور پر جانتا ہے۔ وہ اُن میں رہنا اور انہیں اپنی حضوری کی مبارک قدرت اور خیر سے بھرنا چاہتا ہے +

بعض اشخاص نے شخصیت کی خاصیت سے یوں استدلال کیا ہے۔ وہ خدا جو تشخص کی صفات سے متصف ہے لازم ہے کہ وہ اپنے تئیں کسی نہ کسی طرح ظاہر فرمائے۔ چنانچہ مسٹر النگ ورتھ صاحب کہتے ہیں کہ محبت جس سے مراد ایک شخص کا دوسرے اشخاص کے ساتھ بے تکلف راہ و ربط رکھنا ہے۔ شخصیت کی ایک لازمی صفت ہے۔ مسٹر النگ ورتھ صاحب کی گہری تشریح کے مطابق شخصیت میں تین عنصر پائے جاتے ہیں۔ اوّل خودشناسی دوم قوّت ارادی۔ سوم وہ صفات جو ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ دوسروں سے رفاقت پیدا کریں۔ وہ عقل مرضی اور محبت ہیں ہم طبعاً ایسے بنے ہوئے ہیں کہ ہم بے جان اشیاء کو اور اُس علم کو جو کسی اَور پر ظاہر نہیں کیا گیا۔ اور اُس جذبہ یا خواہش کو جس میں دوسرے شامل نہیں ہوئے ایک خاص انجام کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ہم گویا اس وسیلے کے ذریعے آگے آگے بڑھتے جاتے ہیں تاوقتیکہ ہم اُس حد تک نہیں پہنچ جاتے جہاں ہم کو ہمارے جیسے اشخاص ملتے جنکے ساتھ ان چیزوں کا باہمی تبادلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت ہم اپنے دلوں میں آرام پاتے ہیں۔ پس ہم اس بات کے محتاج ہیں کہ ہمیں دوسرے اشخاص میں وہ انجام ملے جس میں ہماری پوری شخصیت آرام پائے۔ اب اگر خدا بھی شخصیت رکھتا ہے تو اُس میں یہ شخصیت کی لازمی صفت ضرور ہونی چاہیئے۔ پس ضروری امر ہے کہ وہ بھی دوسرے اشخاص کی موجودگی کا خواہاں ہو جن کی ہستی کے وسیلے اُسکی ذات کا تقاضا پُورا ہو۔ اب وہ اشخاص جو مسٹر النگ ورتھ کے استدلال کی پیروی کرتے ہیں وہ اُن کے اس نتیجہ کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ ہم کسی شخص کی نسبت یقیناً قائم نہیں کر سکتے کہ وہ دوسرے اشخاص کو پیدا کر رہا ہے بغیر اس غرض کے کہ اُنکی

تخلیق کے بعد انہیں اپنی رفاقت میں لے۔
معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا دونوں اصحاب اس بات کو ممکن سمجھتے ہیں کہ خدا کی روح بلا وساطت کسی ذریعہ کے انسان کی روح کے ساتھ رفاقت رکھ سکتی ہے اور اُسے اپنی معموری میں سے معمور کر سکتی ہے۔ گو یہ بات تجربہ میں بہت نظر نہیں آتی ہے تاہم نوشتوں میں بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ جو اس قیاس کی تائید کرتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان اور خدا کے باہمی مکالمہ کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جسکے متعلق انسان کی عقل علم الٰہی کی تحقیقات کی مختلف نواح میں حیران ہو رہی ہے۔

۴۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا خدا نے اپنے تئیں ظاہر فرمایا ہے اور اگر ظاہر فرمایا ہے تو کہاں؟ اظہر ہے کہ اُس نے اپنے تئیں اپنے کاموں میں ظاہر کیا ہے۔ جو کچھ اُس نے بنایا اور جو کچھ اُس نے کیا ہے اُس سے اُسکی سیرت منکشف ہوتی ہے۔ بعضوں نے اس اظہار کو پہچانا اور بعضوں نے نہیں پہچانا ہے مگر اُنکے پہچاننے یا نہ پہچاننے سے اس صداقت میں فرق نہیں آتا کہ خدا نے خلقت میں اپنے آپ کو ظاہر کر دیا ہے۔ جس طرح تم آدمی کے کاموں کے وسیلے آدمی کی ہستی کو دریافت کرتے اور اُس کی سیرت سے واقفیت پیدا کرتے ہو۔ اسی طرح خدا بھی دُنیا میں حاضر ہو کر اور اُس میں اپنی قدرت کو کام میں لا کر اپنی ہستی اور ذات کو آشکارا کرتا ہے۔ اگر یہ تمام یونیورس (عالم) جس میں دائمی قوانین اور اٹل طاقتیں موجود ہیں اور جس میں مختلف اقسام کی جاندار ہستیاں نظر سے گزرتی ہیں اگر خدا کی تجویز اور خالقانہ قدرت کا نتیجہ ہے تو یہ سب کچھ جو دُنیا میں نظر آتا ہے اُس کی ذات کی نسبت خبر دینے میں قاصر نہیں ہے۔ آسمان خدا کا جلال ظاہر کرتے ہیں۔ بیشک اس عالم میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کی تہ تک پہنچنا ہماری رسائی سے باہر ہے۔ مثلاً اس میں ظلم ہے اس میں دُکھ ہے۔ اس بھید کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔ تاہم اس گوناگوں عالم سے ہستی کی وسعت۔ اور جو طاقتیں کام آرہی ہیں اُنکے انتظام کی بے بدل درستی اور قوت کو جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا دیکھتے ہیں۔ اور اس معائنہ کے وسیلے خدا کی بے بیان قدرت اور لازوال خزانوں کی خبر پاتے ہیں۔ جس قدر زیادہ لوگ

خدا کے اس کشف پر جو بوسیلہ نیچر کے ہوا ہے سوچتے رہے اسی قدر خدا کا تصور
اُن کے قیاس میں بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ اُس کی ذات کے متعلق طرح طرح کے بے ڈھنگے
اور بے ادب خیالات پیدا ہوئے۔ مگر وہ چند دن دُنیا کی ہوا کھا کر مفقود ہو گئے۔
اور ابھی بہت کچھ باقی ہے جو ہمیں اس اظہار سے جو بوسیلہ مادیات کیا گیا ہے سیکھنا
ہے اور اُن کے لئے جو سمجھنے کی طاقت اور لیاقت رکھتے ہیں ذات الٰہی کا یہ انکشاف
صفحہ موجودات پر آفتاب کی روشنی کی طرح چمک رہا ہے۔ کسی شخص نے خوب کہا ہے
کہ اگر ہم اُس کتاب کی جسے ہم دُنیا کہتے ہیں ورق گردانی کر سکتے تو اُسکی حکمت اور
فن سے جس نے اسے مرتب کیا ہے اور جو اسکی اصلاح کرتا ہے واقف ہو جاتے۔
ہم اُسکی قدرت کو جو بے لگام طاقتوں کو رام کر لیتی ہے۔ اور اُس پروردگاری کو
جو ہر جگہ کام کر رہی ہے جان جاتے اور اسی طرح اُس انصاف سے واقف ہو جاتے
جو کسی باغی کو نہیں چھوڑتا۔ لیکن ہم ایسے نادان ہیں کہ بچوں کی طرح رنگین چمڑے کے
دیکھنے پر اکتفا کرتے۔ سُنہری ورقوں ہی کو سب کچھ سمجھتے۔ خوبصورت اور آویزاں
فیتوں پر دل لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور سب سے اچھی چیزوں کی پروا نہیں کرتے
یعنی کتاب کے مصنف کے معنوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور کبھی کسی چیز
پر دل لگاتے بھی ہیں تو وہ تصویریں ہوتی ہیں جو محض حاشیہ پر کھنچی ہوئی ہوتی ہیں۔
لیکن عبرانیوں کے خط کے مصنف کے قول کے مطابق خدا نے ہم سے طرح طرح
کلام کیا ہے۔ یعنی کئی صورتوں میں اپنے آپکو ظاہر فرمایا ہے۔ اُن میں سے ایک صورت
یہ ہے کہ وہ انسان میں ظاہر ہوا ہے۔ اور اُس میں اُس کی سیرت زیادہ صفائی سے
منکشف ہوئی ہے۔ نیز اُس نے اپنے آپ کو اُس حکومت میں ظاہر فرمایا ہے جو انسان
کے متعلق اُس کی پروردگاری کے کاموں میں نظر آتی ہے۔ مثلاً انسان اپنے اس علم
سے کہ میں ایک اخلاقی ذات رکھتا ہوں۔ اور اپنی اُس جبلی طاقت سے جسکی بدولت
وہ نیکی کو پسند کرتا اور خود انکاری کی خوبصورتی کو محسوس کرتا ہے۔ اور نیز اُس ملکہ سے
جسکے وسیلے سے وہ ہر ایک خوبصورت شے کی داد دیتا۔ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ خدا کی
ذات جو ان چیزوں کا سرچشمہ ہے کیسی ہے۔ جس قدر انسان خیر اور نیکی میں ترقی

کرتا جاتا ہے اُسی قدر اُس کا تصور بہ متعلق ذات الٰہی صاف ہوتا جاتا ہے۔ وہ دیکھتا کہ جو کچھ مجھ میں اچھا ہے وہ خدا میں لامحدود صورت میں پایا جاتا ہے۔ اور جسقدر وہ خدا کی قدرت واسعہ کے وسیلے اُن اخلاقی خوبیوں اور عظیم باتوں کو دیکھتا ہے جو پہلے اُس کی نظروں سے غائب تھیں اُسی قدر اُسکے خیالات و تصورات خدا کی ذات کی نسبت وسیع ہوتے جاتے ہیں یوں انسان اپنی ہی ذات کے وسیلے خدا کو پہچان لیتا ہے۔ ایک شخص نے اس صداقت کو خوب ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "جو کچھ خدا مجھ سے طلب کرتا ہے میں اُسی سے جانتا ہوں کہ وہ خود کیسا ہے"۔

لیکن وہ الٰہی مکاشفہ جس نے اُس اظہار الٰہی کے لئے راہ تیار کی جو مسیح میں نمودار ہوا اسرائیل کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ بنی اسرائیل نے خدا کا علم۔ اُس کی پروردگاری کے اُن کاموں کے وسیلے حاصل کیا جو اُنکی تاریخ میں سرزد ہوئے۔ چنانچہ وہ سرعت جس سے بنی آدم کی بعض شاخوں نے خدا کو پہچانا اُس سرعت سے ثابت ہے جس سے اُنہوں نے طوفان سے یہ نتیجہ نکالا کہ خدا پاک ہے۔ اُن کی قوت تمیز اس بات سے ٹپکتی ہے کہ اُنہوں نے اس تباہ کرنے والی بلا کے وقوع کو اپنے گناہوں سے منسوب کیا۔ گویا اُس واقعہ کے وسیلے خدا نے انسان کے دل پر اس بات کو نقش کر دیا کہ پاکیزگی میری لازمی صفت ہے۔ پس طوفان کے وقت ایک ایسا سبق دیا گیا جس کی بنی آدم کو اشد ضرورت تھی۔ اور ایسی صورت میں دیا گیا کہ غبی سے غبی آدمی کے لئے بھی اُس کا سمجھنا مشکل نہ تھا۔ اسی طرح اسرائیل کی ساری تاریخ میں کبھی بوسیلہ اُن مصائب کے جو بدچلنی کے بعد وقوع میں آئیں۔ کبھی اُس بے توبگی اور کمزوری کے وسیلے جو بیوفائی کے بعد حادث ہوئی لوگوں نے اس بات کو زیادہ زیادہ صفائی سے پہچان لیا کہ وہ خدا جو اُن پر مسلط ہے وہ راستی اور فضل کا خدا ہے۔ یوں وہ خدا کی سیرت کے رازوں سے دن بدن زیادہ واقف ہوتے گئے۔ یعنی اُنہوں نے اُن واقعات کے وسیلے جو خدا نے اُنکے تاریخی سلسلہ میں منسلک کر دئے خدا کو پہچان لیا۔

اسکے متعلق یہ بات خاص طور پر غور کے لائق ہے کہ خدا نے اُنکی تاریخ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنے تئیں نجات دہندے کی صورت میں ظاہر فرمایا۔

اُس نے اُن پر منکشف کر دیا کہ وہ اپنے لوگوں کی اس دُنیا میں حمایت کرتا۔ اُن کی بھلائی کو مدنظر رکھتا ہے۔ اور اُن کے نقصان سے ہرگز ہرگز خوش نہیں ہے۔ کہ وہ اُن کے گناہ معاف کرتا اور نیز اُن کے گناہوں کے سبب سے اُن کو دھمکاتا اور تنبیہ کرتا ہے۔ تاہم ہر وقت اُنہیں اپنی قربت اور حضوری میں پھر قبول کرنے کو تیار ہے۔ ہاں یہی بات اُن لوگوں کے دلوں پر جو بنی اسرائیل میں روشن ضمیر تھے نقش ہو گئی تھی۔ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا کہ یہواہ وہ خدا ہے جو اپنے لوگوں کی خلاصی چاہتا ہے اور اپنے اس نجات بخش کام کو برابر انجام دیتا چلا آیا ہے۔ مثلاً مزامیر اور صحائف انبیا اس بات کی دائمی شہادت ہیں کہ اسرائیل پر اس بات نے خوب اثر کر دیا تھا کہ خدا نے ہم پر اپنے تئیں نجات دہندہ کی حیثیت میں ظاہر فرمایا ہے*

لیکن یہ تاریخ جسے کاشف صفات الٰہی کہنا چاہئے۔ جس کے سلسلہ میں خدا کے بندوں کو طرح طرح کے تجربہ نصیب ہوئے اور جس میں وہ قسم قسم کے رسوم پائے جاتے تھے جنہوں نے خدا کے اظہار کو جو اُس وقت تک بنی اسرائیل کو نصیب ہو چکا تھا محفوظ رکھا۔ غرضیکہ یہ ساری تاریخ جس کے وسیلے سے خدا نے اپنی حضوری اور تعلق سے اُنہیں آگاہ فرمایا اُس کشف کی تیاری تھی جو مسیح میں کمال کو پہنچا۔ مسیح میں جو کشف الٰہی ہمیں نصیب ہوا اُس کی کمالیت کو دو باتیں ثابت کرتی ہیں (۱) اُسکی شخصیت (۲) اُسکی نجات بخش تاثیر*

(۱) واضح ہو کہ یہ کشف جو ہمیں مسیح میں نصیب ہوا ہے شخصیت رکھنے والا ہے لہذا کامل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ خدا نے مسیح [illegible] صفات کو مثلاً اپنی پاکیزگی۔ محبت اور سیلف سیکری فائس ([illegible]) کو شخصی اور اور انسانی کاموں کے وسیلے ظاہر فرمایا ہے۔ یا یوں کہیں کہ وہ اس کشف کے وسیلے ایسے طور پر اپنے آپ کو بنی آدم سے ربط دیتا ہے کہ اُس کا یہ رابطہ انسان بخوبی سمجھ جاتا ہے۔ چنانچہ فقط اُسی وقت یہ کہنا ممکن ہوا کہ جس نے مجھے دیکھا ہے اُس نے باپ کو دیکھا ہے جب کہ مسیح ظاہر ہوا فقط اُسی وقت

لوگ یہ کہنے کے قابل ہوتے کہ خدا کی ہمدردی وہی ہے جو ہم یسوع میں دیکھ رہے ہیں کہ وہ تصدق۔ وہ قربانی وہ معافی اور وہ دعوت جو خدا گنہگاروں کے لئے رکھتا ہے وہی ہے جو مسیح میں نظر آ رہی ہے۔ پس مسیح کے وسیلے خدا کا ایسا اعلےٰ تصور اس دنیا میں آیا جس کی مانند آگے کبھی انسان کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہاں اس نے ایک ایسا تصور ذات الٰہی کا اس دنیا کو دیدیا ہے جس سے اور تصورات کا جو اسکی ذات کی نسبت دنیا میں مروج ہیں اب موازنہ کیا جاتا ہے۔ بعض وقت لوگوں کو یہ خیال گزرتا ہے کہ کیا جب ہم خدا سے ہر طرح کی نیکی منسوب کرتے ہیں تو اس وقت اپنے ذہن اور واہمہ سے ایک خدا تیار نہیں کرتے؟ لیکن جب ہم مسیح کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو ہم پر منکشف ہوجاتا ہے کہ اس کی زندگی میں یہ سب باتیں موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ جس خدا کی ہم تلاش میں ہیں وہ ہم کو اس میں نظر آتا ہے۔ پس اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اپنے کامل مکاشفہ کے لئے خدا ایک شخص میں اپنے آپ کو ظاہر فرمائے۔

(۲) پھر یہ کشف الٰہی نجات کے اعتبار سے بھی کامل ہے۔ مسیح نے خدا کی حکمت اور پاکیزگی اور محبت کو فقط ذہنی طور پر ظاہر نہیں کیا۔ بلکہ ایسے طور پر کہ جس سے بیّن ہے کہ وہ ایک خاص مقصد کی انجام دہی کے لئے۔ یعنی ہمیں گناہ سے خلاصی بخشنے کے لئے اپنی الٰہی محبت اور قدرت کو صرف کر رہا ہے۔ اور اس مقصد کو مسیح میں ایسے کامل طور پر انجام دیا ہے کہ اب کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ یعنی کہ نہ اس میں کوئی اور چیز بڑھائی جاسکتی ہے اور نہ کمی کو پورا کرنے کے لئے کسی اور شے کے داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جب اس نے یہ الفاظ اپنی زبان سے نکالے کہ جو کام تو نے مجھے کرنے کو دیا تھا میں اسے کر چکا ہوں تو اس نے ایک سچی حقیقت کو اپنے لفظوں کے وسیلے ظاہر کیا۔ خدا نے اس میں دنیا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ خدا کی وہ خواہش جو وہ ہماری نجات کی نسبت رکھتا تھا کسی اور مکاشفہ سے ایسے زور اور صفائی کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتی۔ اور نہ ہم پھر خدا کی محبت اور قدرت کا اظہار نجات کے متعلق کبھی ایسا دیکھینگے۔

اس بات کو مدِنظر رکھکر کہ خدا کی روح اور انسانی ارواح ایک دوسری کے آس پاس موجود ہیں اور کہ انسان اور خدا میں ایک قسم کا رشتہ بھی پایا جاتا ہے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ دونوں قسم کی روحیں (یعنی انسانی اور الٰہی ارواح) آپس میں ایک دوسری کو اپنے خیالات سے آگاہ کرسکتی ہیں نادرست نہیں ہے۔ فلائڈرر ([illegible]) صاحب اپنی کتاب موسومہ "فلاسفی آف ریلیجن" میں یوں استدلال کرتے ہیں "جب انسان انسان کے ساتھ دوستانہ رفاقت رکھ سکتا ہے تو ہم کیوں اُس رفاقت کو جو خدا بنی نوع انسان کے ساتھ رکھ سکتا ہے ناممکن سمجھیں؟ میری راے میں انسان انسان کے ساتھ ایسی گہری رفاقت نہیں رکھ سکتا جیسی کہ خدا انسان کے ساتھ رکھ سکتا ہے کیونکہ جس طرح آدمی آدمی کے دل کا حال کماحقہٗ نہیں جان سکتا اُسی طرح وہ کسی دوسرے آدمی کے دل میں پُورے پورے طور پر گھُس کر بود و باش بھی نہیں کرسکتا۔ اسی لئے انسانی محبت ناکامل ہے اور ہمیشہ ناکامل رہتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دل میں بہ سبب اپنی اپنی محدود بشریت کے داخل نہیں ہوسکتے۔ مگر خدا ان تقیدات سے آزاد ہے۔ لہذا جس طرح ہم میں سے ہر ایک کا دل اُسکے لئے کھُلا ہے۔ اُسی طرح اُس کا دل خدا کے لئے کھُلا ہے۔ جس طرح ہم آئینہ میں سے ایک سرے سے دوسرے تک دیکھ سکتے ہیں۔ اُسی طرح اُس کی نگاہ ہمارے دلوں میں سے گزرجاتی ہے وہ اُن میں سکونت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ وہ اُنہیں اپنی پاک قدرت اور برکت سے لبریز کرنے کی آرزو رکھتا ہے ؎

پھر بعض علما نے شخصیت کے خواص سے استدلال کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لازمی امر ہے کہ وہ خدا جو اوصاف تشخص سے مُتصف ہے اپنے آپ کو ظاہر فرمائے۔ چنانچہ النگ ورتھ صاحب فرماتے ہیں کہ محبت (یعنی دوسرے اشخاص کے ساتھ ملنے جُلنے کی خواہش) شخصیت کا ایک ضروری خاصہ ہے۔ النگ ورتھ صاحب کی توجہ طلب تشریح کے مطابق شخصیت تین اجزا سے مرکب ہے۔ اور وہ اجزا یہ ہیں۔ ذاتی شناخت یعنی اپنی جداگانہ ہستی کا ادراک۔ دوم قوت ارادی

یعنی اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کی طاقت۔ سوم۔ وہ خواہشات جن کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ ہم دوسرے اشخاص کے ساتھ مکالمے اور رفاقت کا رابطہ پیدا کریں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ وہ اجزاء عقل۔ ارادہ اور محبت ہیں۔ النگ ورتھ صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری ساخت فطرتاً ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہم بے جان اشیاء کو اور اپنے اس علم کو جو ہنوز کسی پر ظاہر نہیں کیا گیا اور ان جذبات کو جن میں ابھی اور کوئی شامل نہیں ہوا۔ ایک خاص مقصد یا انجام کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ہاں ہم ان کے وسیلے اپنے جیسے اشخاص کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اور جب ہم انہیں پا لیتے ہیں تو ان باتوں کو ان پر ظاہر کرتے یا یوں کہیں کہ باہم تبادلہ کرتے ہیں اور یوں ہمارے دلوں کو آرام ملتا ہے۔ گویا ہم ان وسائل کے ذریعے ان اشخاص میں جو ہمارے جیسے ہیں وہ انجام پاتے ہیں جس میں ہماری شخصیت کو آرام ملتا ہے۔ اور اسی کو محبت کا رشتہ کہتے ہیں"۔ اب اگر خدا بھی شخصیت رکھتا ہے تو لازمی امر ہے کہ اس میں بھی شخصیت کا یہ خاصہ موجود ہو۔ پس ضرور ہے کہ وہ ایسے اشخاص کی ہستی اور موجودگی کا خواہاں ہو جن کے وجود سے اسکی پاک ذات کا یہ تقاضائے محبت پورا ہو۔ اب جو لوگ اس دلیل سے اتفاق رکھتے ہیں وہ النگ ورتھ کے مرقومۂ ذیل نتیجہ کے ساتھ پورے پورے طور پر متفق ہیں۔ وہ نتیجہ یہ ہے "یہ بات ہمارے قیاس میں نہیں آتی کہ ایک شخص (یعنی خدا) اور اشخاص (یعنی بنی انسان) کو پیدا کرے اور ان کی پیدائش سے اس کی یہ غرض نہ ہو کہ انکے اوپر اپنے آپ کو ظاہر کرے اور انہیں اپنی رفاقت سے محفوظ فرمائے"۔

اب ان مذکورۂ بالا دونوں صاحبوں کی دلائل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کی روح کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ براہ راست انسانی روح کے ساتھ مکالمہ پیدا کرے یعنی بدون کسی وسیلے یا وساطت کے خدائی روح انسان کی روح کے ساتھ مس پیدا کر سکتی اور اسے اپنی بھرپوری سے مالامال کر سکتی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ گو عام تجربہ اس دعوے کی بہت تائید نہیں کرتا تاہم کلام اللہ میں بہت سی باتیں ایسی پائی ہیں جو اس تصور کی صحت کی بہت درجہ تک تائید کرتی ہیں لیکن

یہ بات ہے ہی کچھ اس قسم کی کہ اس کو ثابت کرنا ایک مشکل سا کام ہے۔ ہاں خدا اور انسان کے باہمی مکالمہ کا مسئلہ واقعی ایک ایسا سوال ہے جسکے متعلق انسان کی عقل تھیولاجیکل (علم الٰہی کی) تحقیق کی مختلف نواح میں اپنے آپ کو متحیر پاتی ہے۔

۳۔ اب تیسری بات غور طلب یہ ہے کہ آیا خدا نے اپنے آپ کو کسی طرح ظاہر فرمایا ہے یا نہیں۔ اگر ظاہر کیا ہے تو کہاں کیا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ خدا نے اوّل اپنے تئیں اپنے کاموں کے وسیلے ظاہر فرمایا ہے۔ جو کچھ اُس نے خلق کیا ہے۔ اور جو کچھ اُس نے بنایا ہے اُس سے اُس کی سیرت ظاہر ہوتی ہے۔ لوگوں نے اُس کے اس اظہار کو خواہ سمجھا یا نہ سمجھا یہ دوسری بات ہے۔ مگر اظہار کی موجودگی پر کسی طرح کی چون و چرا نہیں ہو سکتی۔ جس طرح آپ بنی آدم کے افعال کے وسیلے اُن کی ہستی کے قائل اور اُن کی خو و خصلت سے واقفیت پیدا کرتے ہیں۔ اُسی طرح خدا بھی اس دُنیا میں موجود ہو کر اور اپنی قدرت کے کرشمے دکھا کر اپنی حیات اور صفات کو ظاہر فرماتا ہے۔ اگر یہ تمام عالم جس میں طرح طرح کی طاقتیں اور قوانین اور قسم قسم کی اشیا موجود ہیں۔ اُسی کی تجویز اور رضا لقانہ قدرت اور مرضی کے وسیلے وجود میں آیا ہے تو لازم ہے کہ اس دُنیا کے نظارے ضرور اُسکی ذات و صفات کا کچھ کچھ پتہ تو دیں۔ بیشک آسمان اُس کا جلال ظاہر کرتے ہیں۔ البتہ بہت سی باتیں ایسی موجود ہیں جن کا سمجھنا ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ مثلاً اُس ظلم اور دُکھ کی کُنہ تک پہنچنا جو خلقت کے حلقہ میں موجود ہے ہماری بساط سے باہر ہے۔ تاہم گوناگوں ہستی کے نظارے اور قدرتی طاقتوں کا باقاعدہ قیام اور اُن کا وہ زور جس پر کوئی طاقت غالب نہیں آسکتی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ان چیزوں کو دیکھکر ہم خدا کے بے زوال خزانوں اور بے قیاس قدرت کا کچھ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ جوں جوں لوگ خدا کے اس اظہار پر جو اُس کی دستکاری سے مترشح ہوتا ہے غور و فکر کرتے گئے ہیں اُسی نسبت سے خدا کا تصور اُن کی عقول پر ظاہر ہوتا گیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ خدا کی ذات کے متعلق ناسزا اور نامناسب اور اُسکی شان پر بٹہ لگانے والے تصورات مروج تھے۔ مگر اب وہ قریب قریب معدوم ہو گئے ہیں۔ تاہم ابھی ہیں اندیکھے خدا کے

اُس اظہار و انکشاف کی نسبت جو مادیات سے ٹپک رہا ہے بہت کچھ سیکھنا ہے پس یاد رکھنے کے قابل جو بات ہے وہ یہ ہے کہ اُسکی خلق کی ہوئی چیزیں اُس کا مظہر ہیں اور وہ جن کی چشم بصیرت وا ہے اُسکے ظہور کا جلوہ اُسکی خلقت میں دیکھ رہے ہیں ایک شخص نے کیا خوب کہا ہے۔ "جسے ہم دُنیا کہتے ہیں وہ ایک خوبصورت کتاب ہے۔ اگر ہم اُس کی جزوں اور ورقوں کو ذرا گہری نظر سے دیکھیں تو ہمیں اُس کے مصنف اور مصحح کی حکمت اور دانائی کے کئی پکے اور صاف ثبوت دکھائی دینگے۔ ہمیں اُس کی وہ قدرت دکھائی دیگی جو بڑی بڑی خونخوار طاقتوں کو بھی رام کر لیتی ہے۔ ہمیں اُس کی اُس پروردگاری کے کرشمے نظر آئینگے جو ہر ایک چیز تک پہنچتی ہے۔ اور اُس کا وہ انصاف معائنہ سے گزریگا جو مغرور سے مغرور اور زور آور سے زور آور باغی کو بھی نہیں چھوڑتا۔ لیکن ہم ایسے نادان ہیں کہ کوتہ اندیش بچوں کی طرح کبھی اُس رنگین چمڑے کو دیکھتے رہتے ہیں جس پر اس عجیب مصنف کی عجیب عبارتیں مسطور ہیں۔ اور کبھی سُنہلے اوراق پر نگاہ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور کبھی اُن فیتوں کا ملاحظہ کرنے لگ جاتے ہیں جو اس کتاب میں سے لٹک رہے ہیں لیکن جو چیزیں درحقیقت قابلِ غور ہیں اُن پر دھیان نہیں لگاتے۔ یعنی اس مصنف کے خیالات اور معانی کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر اتفاق سے کسی چیز پر غور کی نظر ڈالتے ہیں تو وہ فقط کوئی چھوٹی موٹی سی تصویر ہوتی ہے جو ہمیں متن کے حاشیہ پر کھنچی ہوئی ملتی ہے"۔

لیکن عبرانیوں کے خط کا مصنف ہمیں یاد دلاتا ہے کہ خدا نے ہمارے ساتھ طرح بطرح کلام کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے طرح بطرح اپنے آپکو ہم پر ظاہر فرمایا ہے۔ ہاں خدا نے ہم پر اپنے تئیں نہ صرف صفحہ فطرت کے وسیلے ظاہر کیا ہے بلکہ اور صورتوں میں بھی اپنے ظہور سے ہمیں مالا مال فرمایا ہے۔ خدا کا ایک اور مظہر انسان خود ہے۔ واقعی اور چیزوں کی نسبت انسان کی ذات کے اور نیز اُس انتظام پروردگاری کے ذریعے جس کے وسیلے خدا انسان پر حکمرانی کرتا ہے خدا کی سیرت زیادہ واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

آدمی اپنی اخلاقی ذات اور نیکی کو پسند کرنے والی صفات اور خود انکاری کی مردانہ خوبیوں پر فدا ہونے والی عادات وغیرہ سے یہ جان لیتا ہے کہ خدا کی جو میرا خالق ہے اور ان سب خوبیوں کا سرچشمہ ہے ماہیت کیا ہے۔ جس قدر انسان نیکی میں ترقی کرتا جاتا ہے اُسی قدر اُس کا تصور خدا کی بنسبت صاف ہوتا جاتا ہے۔ ہاں وہ اپنی ہی اُن کوششوں کے وسیلے جو وہ نیکی اور نیکی کے طبعی مذاق کی پیروی میں کرتا ہے اس بات کو پہچاننے لگتا ہے کہ خدا کیا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ مجھ میں سب سے اچھا ہے وہ ادھورا اور ناکامل ہے۔ فقط خدا میں وہ نیکی یا خوبی جو مجھ میں ناکامل ہے کامل اور لامحدود صورت میں پائی جاتی ہے اور جوں جوں وہ خدا کی روشنی بخش تاثیروں کے ماتحت اُن اخلاقی خوبیوں اور اعلےٰ صداقتوں کو جو آگے اس کی نظر سے پوشیدہ تھیں دیکھنا جاتا ہے اسی قدر خدا کی ذات وصفات کے وسیع اور صحیح خیالات میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ وھیٹر (Whittier) صاحب کے قول کے مطابق انسان اپنی ہی ذات کے وسیلے خدا کی ذات وصفات کا تصور پیدا کرتا ہے۔ وھیٹر صاحب فرماتے ہیں "جو کچھ خدا مجھ سے طلب کرتا ہے اُسی سے میں جان لیتا ہوں کہ وہ خود کیا ہے اور کیسا ہے"۔

لیکن ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ خدا اپنے آپ کو اپنے انتظام پروردگاری میں بھی ظاہر فرماتا ہے۔ اسے ہم تواریخی اظہار کہینگے۔ یہ وہ کشف ربانی ہے جس کے وسیلے اُس نے بنی آدم کو اپنے اُس اظہار کے لئے تیار فرمایا جو بالآخر خداوند مسیح میں نمودار ہوا۔ اس تواریخی اظہار کی نسبت ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ خدا کے بندوں نے اپنے خالق کا عرفان اُن واقعات کے وسیلے حاصل کیا جو اُس کے انتظام پروردگاری کے مطابق اُن کی تاریخ اور زندگی میں سرزد ہوئے۔ جس سرعت سے بنی آدم کی بعض شاخوں نے خدا کا تصور اپنے لئے قائم کیا وہ اُس سُرعت سے ظاہر ہے جس سے اُنہوں نے طوفان کے وقوعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ خدا ایک پاک خدا ہے۔ اُن کے ضمیر کی حس اس بات میں ظاہر ہوئی کہ اُنہوں نے اس تباہ کُن وقوعہ کو اپنے گناہوں کا نتیجہ سمجھا۔ ہاں خدا نے اس حادثۂ جانکاہ کے ذریعے بنی آدم کے دل پر اس بات کو

نقش کردیا کہ اُس کی پاکیزگی اُس کی ذات کا ضروری اور لازمی خاصہ ہے۔ پس ایک نہایت ضروری سبق جو بنی آدم اُس وقت سیکھ سکتے تھے سکھایا گیا اور ایک ایسی صورت اور ایسی زبان میں جو اُس زمانہ کے مناسب حال تھی اور جسکے سمجھنے میں غبی سے غبی آدمی بھی کسی طرح کی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ یہی بات ہم اسرائیل کی ساری تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے اُن مصیبتوں کے وسیلے جو اُن کی کسی خطا کے بعد لاحق ہوئیں یا اُس بے عزتی اور کمزوری کے ذریعے جو خدا سے بیوفائی کرنے کے بعد منتج ہوئی صاف صاف طور پر اس بات کو دیکھ لیا کہ جو خدا ہم پر مسلط ہے وہ راستی اور فضل کا خدا ہے۔ پس وہ زیادہ زیادہ اُس کی خاصیت اور سیرت سے واقف ہوتے گئے۔ اور یہ عمیق اور وسیع علم اُس کی ذات کا اُنہوں نے اُن واقعات سے حاصل کیا جو اُن کی تاریخ میں واقع ہوئے اور جن کے وقوع اور ترتیب میں اُس نے اپنے آپ کو ظاہر فرمایا۔

یہ بات نہایت غور طلب ہے کہ اسرائیل کی ساری تاریخ میں خدائے تعالےٰ اپنے تئیں نجات دہندہ کی صورت میں ظاہر کرتا رہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انکی تاریخ کے ہر صفحہ سے ہویدا ہے کہ خدا اپنے بندوں کا جو دنیا میں بود و باش کرتے ہیں دوست ہے۔ اُس کے خیالات اُن کی نسبت محبت سے مملو ہیں۔ وہ ہمیشہ اُن کی بھلائی چاہتا ہے۔ اور اُن کی بُرائی کا خیال کبھی اُس کے دل میں راہ نہیں پاتا۔ وہ انکے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ اُن کی نادانیوں کے سبب سے اُن کو دھمکاتا اور تنبیہ کرتا ہے۔ مگر آخرکار پھر اُنہیں قبول کرکے اپنی مہربانی سے مالا مال فرماتا ہے۔ جنکی چشم بصیرت وا تھی اُن کے دل پر یہ بات منقوش تھی کہ یہواہ وہ خدا ہے جو اپنے بندوں کی مخلصی اور نجات کا طالب ہے۔ اور کہ وہ ہر وقت ہمارے نزدیک ہے اور نجات کے کام کو زینہ بزینہ چوٹی کی طرف لئے جا رہا ہے۔ زبور اور امثال شاہد ہیں کہ اسرائیل کے دل پر یہ خیال ثبت ہوگیا تھا کہ خدا اپنے بندوں کا نجات دینے والا ہے۔ مگر یہ ساری تاریخ جو ایک طرح خدا کا منظر تھی جس کے صفحات اُن تجربوں سے بھرے پڑے ہیں جو مومنوں کو نصیب ہوئے اور جس میں اُن متفرق رسوم

کا حال قلمبند ہے جن کے وسیلے سے خدا کا وہ علم جو اُس کے بندوں کو حاصل ہو چکا تھا تر و تازہ رہتا تھا۔ غرضیکہ وہ سب باتیں جن کے وسیلے سے خدا نے اپنی حضوری کا علم عطا فرمایا اور یہ جتا دیا کہ میں اپنے بندوں کے لئے کیا چاہتا ہوں اُس اعلےٰ اور کامل مکاشفہ کے لئے جو مسیح میں عطا کیا گیا ایک تیاری کا حکم رکھتی تھیں۔ اس مکاشفے کے متعلق دو باتیں قابل ذکر ہیں جن سے اُس کی کاملیت ظاہر ہوتی ہے۔ اوّل اُس کی شخصیت۔ دوم اُسکی نجات بخش تاثیر۔

(۱) وہ مکاشفہ جو مسیح میں دیا گیا ہے ایک شخصی مکاشفہ ہے لہذا کامل مکاشفہ ہے۔ اور جتنے مکاشفات ذات الٰہی کو ظاہر کرنے والے تھے اُن میں اوصاف شخصیت موجود نہ تھے۔ مگر مسیح میں خدا نے اپنے شخصی اوصاف کو ظاہر فرمایا۔ مثلاً اُس کی پاکیزگی۔ اُس کی محبت اور اُس کا اپنے آپ کو قربان کرنا جو ایک شخصی اور انسانی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ سب الٰہی صفات کے اظہار ہیں۔ اب اس طرح خدا اپنے آپ کو انسان کے معاملات کے متعلّق ایک ایسے رشتہ میں لا کھڑا کرتا ہے کہ اُس رشتہ کا سمجھنا انسان کے لئے مشکل نہیں رہتا۔ چنانچہ جب مسیح ظاہر ہوا تو صرف اُسی وقت یہ کہنا ممکن ٹھیرا "جس نے مجھے دیکھا ہے اُس نے باپ کو دیکھا ہے۔ ہاں صرف اُسی وقت ہم یہ بات اپنے مُنہ سے نکالنے کے قابل ہوئے" یہ بات جو ہم مسیح میں دیکھتے ہیں خدا کی ہمدردی ہے۔ یہ جاں نثاری یہ خود انکاری یہ معاف کرنے کی صفت یہ گنہگاروں کو بچانے کی آرزو جو ہم اُس میں پاتے ہیں وہی ہے جو خدا میں پائی جاتی ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسیح نے دُنیا کو خدا کا وہ اعلےٰ تصور دیا جو آگے انسان کو کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اور وہی تصور اب ایک میزان کا کام دیتا ہے جس سے اور سب تصوّرات کا وزن کیا جاتا ہے بعض وقت لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ جب ہم خدا کی طرف ہر طرح کی خوبی منسوب کرتے ہیں تو ہم اپنے ذہن اور اپنے تصورات کے مجموعہ سے ایک قیاسی ہستی پیدا کر لیتے ہیں جس کا نام خدا ہے۔ لیکن جب ہم مسیح کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو اعلےٰ تصورات ہم رکھتے ہیں

وہ ہم سنے اُسی کے تواریخی اظہار سے پائے ہیں۔ مسیح میں ہم کو وہ کامل خدا جس کی تلاش میں ہم لگے ہوئے تھے نظر آتا ہے۔ اُسی میں ہم کو ایک شخصی خدا کا شخصی اظہار نظر آتا ہے۔ ہاں خدا کو پورے پورے طور پر ظاہر کرنے کے لئے ایک شخص کی ضرورت تھی۔

(۲) پھر یہ مکاشفہ جو مسیح میں بخشا گیا ہے نجات کے کام میں بھی کامل ہے۔ مسیح نے خدا کو ہم پر ایسے طور پر ظاہر نہیں کیا کہ ہم کو صرف اُس کی ان صفتوں سے آگاہی ہو کہ وہ دانا اور پاک اور رحیم ہے۔ بلکہ ایسی صورت میں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا اپنی ساری الٰہی خوبی اور قدرت کو ایک خاص مقصد کی انجام دہی کے لئے ظاہر کر رہا ہے اور استعمال میں لا رہا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ ہمیں بدی کے پنجہ سے رہائی دے۔ اب یہ کام مسیح نے ایسے کامل طور پر انجام کو پہنچایا ہے کہ اب نہ اُس کے دُہرانے کی ضرورت ہے اور نہ اُس میں کچھ بڑھانے کی حاجت۔ پس جب اُس نے یہ کلمات اپنی زبان مبارک سے نکالے "جو کام تو نے مجھے کرنے کو دیا تھا اُس کو تمام کر چکا ہوں"۔ تو گویا اُس نے ایک خاص صداقت کو ظاہر فرمایا۔ اُس میں خدا نے دُنیا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ واقعی جس طرح اُس کی زندگی اور موت کے وسیلے خدا کی وہ آرزو جو وہ ہماری نجات کے مُتعلق رکھتا ہے ظاہر ہوئی ویسی اور کسی طرح ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اور نہ خدا کی طاقت نجات دینے کے معاملے میں اس طرح پھر کبھی ظاہر ہو گی۔

۴۔ اب ایک اور سوال درپیش ہے جس کا جواب تلاش کرنا ہمارا فرض ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ خدا نے اپنا مکاشفہ ہمیں کس طرح عطا فرمایا ہے۔ یا یوں کہیں کہ خدا نے اپنے آپ کو ہم پر کس طریق سے ظاہر کیا ہے۔ اس سوال کا جواب اُس تصور پر موقوف ہے جو ہم ذات باری کی نسبت رکھتے ہیں۔ اگر ہم خدا کی نسبت یہ تصور رکھتے ہیں کہ وہ دُنیا اور انسان کے اندر موجود ہے تو ضروری امر ہے کہ ہم یہ بھی مانیں کہ خدا اُس انسانی احساس یا ادراک کے وسیلے جو انسان روحانیت کے متعلق رکھتا ہے۔ باطنی طور سے اپنے آپ کو اُس پر ظاہر فرماتا ہے۔ پر اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ انسانی اور دُنیوی دائرے سے بالکل بلند اور بالا ہے تو اُس حالت

میں ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ وہ انسان پر خارج سے اثر کرتا ہے۔ پہلی صورت میں خدا کا مکاشفہ اندرونی اور فطرتی ہوگا۔ دوسری حالت میں خارجی اور فوق العادت ٭

واضح ہو کہ خدا کا یہ تصور کہ وہ انسان کے اندر موجود ہے اُس امتیاز کو جو نیچرل اور سوپر نیچرل میں پایا جاتا ہے دور کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک چیز جو نیچرل نظر آتی ہے وہی اگر ہم چاہیں تو سوپر نیچرل بھی معلوم ہونے لگ جاتی ہے تمام نیچر زندہ خدا کی حضوری اور قدرت سے بھرپور ہے " جس طرح کوئی نبی سوائے اُس کی قدرت کے اُس کی مرضی کو ظاہر نہیں کر سکتا اور جس طرح کوئی مقدس اُس کی طاقت کی تاثیر کے بغیر اپنے آپ کو اُس کی صورت میں تبدیل نہیں کر سکتا اُسی طرح کوئی سوسن کا چھوٹا سا پھول اُسکی قدرت کاملہ کی تاثیر کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا" پس اگر وہ لوگ جو خدا کے دُنیا میں موجود ہونے کے قائل ہیں یہ کہیں کہ کشف الٰہی ایک طرح سے نیچرل ہے تو ہم اس سے یہ نہ سمجھیں کہ وہ انکشاف الٰہی قدرت کی وساطت کے بغیر وقوع میں آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا مکاشفہ انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ جو طاقتیں اور قوانین انسانی ترقی کو وجود میں لاتے ہیں وہی مکاشفہ پر اثر ڈالتے ہیں۔ اور یہ تمام قوانین خدا کی ذات کا گویا ایک پرتو اور اظہار ہوتے ہیں ٭

اس زمانہ میں جو بات توجہ طلب نظر آتی ہے سو یہ ہے کہ خواہ ہم خدا کو امینینٹ (Immanent موجود بالباطن) مانیں یا ٹرنسنڈنٹ (Transcendent بالاازموجودات) تصور کریں بہر حال ہمیں اس بات کو بھولنا نہیں چاہئے کہ وہ ایک روح ہے اور اُسکے سارے افعال روحانی ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ موسےٰ سے اور نبیوں سے " بولا" اور اُس نے اُن کو اس رسم یا اُس رسم کے ادا کرنے کا حکم کیا۔ یا اُن کو یہ پیغام یا وہ پیغام دیا تو ہم اس سے یہ نہ سمجھیں کہ اُن کو یہ خبر جسمانی کان کے وسیلے سے ملتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کے دل اور روح پر ایسا اثر ہوتا تھا کہ وہ خدا کے مطلب کو جان لیتا تھا۔ پولوس نے بہت سے دماغی جدوجہد کے بعد الٰہی چیزوں کی حقیقت کو سمجھنا سیکھا اور اُن مشکل معاملات کا فیصلہ کرنے کی لیاقت حاصل کی جو عملی زندگی

نسے وابستہ تھے اور جن کا فیصلہ اُس سے طلب کیا جاتا تھا۔ سبیٹیر (Sabatier) صاحب کا یہ قول غور طلب ہے "جب خدا نے بنی اسرائیل کو دس احکام دینا چاہا تو اُس نے اُن احکام کو پتھر کی تختیوں پر اپنے ہاتھ سے تحریر نہ کیا بلکہ موسےٰ جیسے آدمی کو برپا کر دیا۔ اُس کے روحانی ادراک سے دس احکام پیدا ہوئے۔ اسی طرح جب اُس نے ہمیں رومیوں کا خط دینا چاہا تو پولوس کو سامنے بٹھا کر لکھوانا پسند نہ کیا بلکہ تارسیسی ساؤل جیسے شخص کی طبیعت اور لیاقت کے آدمی کو پیدا کر دیا۔ یہ جانکر کہ جب درخت لگ جائیگا تو پھل خود بخود پیدا ہو جائیگا۔"

اعمال کی کتاب کے تیرھویں باب میں مکاشفہ کی ایک نہایت معنی خیز مثال پائی جاتی ہے کہ جب وہ عبادت کر رہے تھے تو "روح القدس نے کہا کہ میرے لئے برنبا اور ساؤل کو اُس کام کے واسطے مخصوص کردو جس کے واسطے میں نے اُنکو بلایا ہے"۔ ان لفظوں کو پڑھکر شاید کوئی بھی یہ خیال نہیں کریگا کہ ایک آواز ظاہراً سُنائی دی تھی جس کے وسیلے سے یہ حکم اُن کو پہنچایا گیا (واضح ہو کہ یہ خیال مصنف کا ہے۔ اگر کوئی شخص جو فوق العادت قدرت کا قائل ہے اس بات کو مانے کہ درحقیقت ایک آواز آئی تو ایسا ماننا اُس کے لئے ناممکن نہیں ہے۔ مترجم) ہر ایماندار اس بات کو سمجھتا ہے کہ روح القدس نے اپنی مرضی کو زیادہ باطنی اور پُراثر صورت میں ان لوگوں کے دلوں پر نقش کر دیا۔ اور کس طرح؟ جواب یہ ہے کہ اُن لوگوں کے دلوں میں اپنی آواز پیدا کر کے جو اُس کی ہدایت کے جویاں تھے۔ پھر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان لوگوں نے کبھی اس مضمون پر سوچا نہیں تھا اور کہ یہ خیال یکبیک اُن کے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ غالباً یہ خیال اُن کی اُس کوشش کا نتیجہ تھا جو اُنہوں نے خدا کی ماہیت کے دریافت کرنے میں مبذول کی۔ یا یوں کہیں کہ وہ سوچتے تھے کہ ہمیں موجودہ حالات کی موجودگی میں کیا کرنا چاہیئے پس برنباس اور ساؤل کی تخصیص گویا اس غور و فکر کا ایک نتیجہ تھا۔ وہ اندرونی طور پر اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ جو کچھ ہم اس وقت کرنے لگے ہیں وہ خداوند کی مرضی کے

مطابق ہے۔ کلیسیا کی ساری تاریخ میں پولوس اور برنباس کے تقرر سے بڑھ کر اور کوئی کام نہیں ہوا۔ مگر یہ کام مسیح کی مرضی کے اُس اظہار پر مبنی تھا جو اُنہیں اندرونی طور پر حاصل ہوا تھا اور وہ اسی واسطے نہایت محفوظ اور مضبوط تھا۔ وہ لوگ اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ ہم اُسی کی مرضی بجا لا رہے ہیں اور اُسی کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں ہم کو الہامی مکاشفہ کی گویا ایک کنجی ملتی ہے۔ وہ لوگ جو خدا کے ہمدرد اور ہمخیال ہیں وہ اُس کی مرضی کو سمجھ لیتے ہیں وہ اُسکی عدالتوں اور مطلبوں کو پہچان لیتے ہیں اور یوں اُس کے مکاشفے کے آلے بن جاتے ہیں۔

لیکن اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر انسان کے خیالات اور خدا کے کشف یا ہدایت میں کچھ تفریق نہیں کی جا سکتی تو پھر یہ کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں بات خدا کی طرف سے ہے اور فلاں اُس کی طرف سے نہیں ہے؟ وہ الٰہی روح جو انسان کے دل پر سچی الٰہی صداقتیں ظاہر فرماتی ہے وہ کونسی روح ہے؟ اور وہ جھوٹی روح جو بنی آدم کو گمراہ کرتی ہے وہ کونسی روح ہے؟ خدا کا اپنے آپ کو اور اپنی مرضی کو ظاہر فرمانا کسے کہتے ہیں۔ اور اپنے قیاس اور وہم کے ڈھکوسلوں میں پھنس جانا کسے کہتے ہیں؟ اس قسم کے سوالات ضرور برپا ہوتے ہیں۔ اور ان سوالات کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں دیا جا سکتا کہ ہر نبی یا رسول کے نزدیک اُن مکاشفات کی اصلیت کی کسوٹی اور کوئی شے نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ پورا پورا یقین رکھتا ہے کہ مجھے خدا کی رفاقت حاصل ہے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے کہ جس شخص نے حق تعالیٰ کی روح کو محسوس کیا ہے وہ اُس کی نسبت نہ مغالطہ کھا سکتا ہے۔ نہ اُس پر شک لا سکتا ہے اور نہ اُس کا انکار کر سکتا ہے۔ وہ تمام دُنیا کی طرف مخاطب ہو کر یوں کہا کرتا ہے۔ اے دُنیا تو اگر انکار کرتی ہے تو کر۔ تو ایک طرف کھڑی ہو۔ اور میں اکیلا دوسری طرف کھڑا ہوں۔

اور اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا کلیسیا یا جماعت پر یہ فرض ہے کہ وہ نبی کی باتیں محض اُس کے کہنے پر مان لیا کرے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ جس طرح

نبی اپنے فعلوں کا ذمہ دار ہے اُسی طرح لوگ بھی خدا کے سامنے ذمہ دار ہیں پس اُن کا فرض ہے کہ وہ اُس نبی کی باتوں کو اُس پرتو کے مطابق قبول کرے یا رد کرے جو کہ سچائی اور خدا کے مُتعلق نبوی پیغام میں منعکس ہونا چاہئے یعنی اگر کلیسیا یا دینداروں کی جماعت یہ محسوس کرے کہ اُس کا پیغام واقعی خدا کی طرف سے ہے اور راستی پر مبنی ہے تو اُسے قبول کرے۔ ورنہ اُس سے پہلوتہی کرے ❖

واضح ہو کہ کشف الٰہی کا طریقہ اور بھی واضح ہوجائیگا اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اور اسی بات پر غور کریں ❖

۵۔ اپنے آپ کو انسان پر ظاہر کرنے سے خدا کی کیا غرض تھی؟ اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاسکتا ہے کہ خدا جو کہ محبت کا خدا ہے یہ چاہتا تھا کہ وہ اُن سب کو جنہیں اُس نے اپنی شکل پر پیدا کیا ہے اور اپنی رفاقت کے لائق بنایا ہے اپنی بھرپوری میں سے کچھ عطا فرمائے۔ لیکن اُس مکاشفہ پر جو کہ بائیبل میں درج ہے خاص طور پر غور کرنے سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ شاید اس سے بھی زیادہ خاص مقصد مدِنظر تھا۔ کیونکہ بائیبل کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آدمی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اُس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے نجات کی ضرورت ہے یعنی اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ گناہ اور بدی سے رہائی پائے۔ شروع ہی میں انسان کے گرجانے کا افسوسناک منظر مشاہدے سے گزُرتا ہے۔ خدا کا کشف جو بنی اسرائیل میں ہوا۔ اور اُس کا وہ کامل مکاشفہ جو یسوؔع مسیح میں ظہور پذیر ہوا وہ انسان کے گناہ سے ایک خاص واسطہ رکھتا تھا۔ اور پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ مکاشفہ ایک ایسا مکاشفہ تھا جس کا علم سب بنی آدم کے لئے ضروری تھا۔ پس ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا اپنی ذات کی نسبت بنی آدم کو یہ عرفان عطا کرنا چاہتا تھا کہ میں تمام بنی آدم کا نجات دینے والا ہوں ❖

لیکن اس مطلب کو پورا کرنے کے لئے فقط اسی ایک بات کی ضرورت نہ تھی کہ خدا اپنے آپ کو اسرائیل کی تاریخ اور رسم و رواج میں ظاہر کرے یا کہ محض مسیح کے وجود اور زندگی میں اپنا پرتو دکھاوے۔ اس سے کچھ زیادہ کرنے کی

ضرورت تھی۔ یعنی اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ اس قسم کے لوگ تیار کئے جائیں جو ان اظہاروں کو پہچانیں اور قدر کریں۔ خدا کی حضوری کے ابتدائی اور بنیادی اظہار سب بنی آدم کے لئے تھے۔ فقط یہودیوں پر ہی نہیں بلکہ سب بنی آدم پر خدا نے اپنے آپ کو اس صورت میں ظاہر فرمایا تھا کہ میں ایک ایسا حاکم ہوں جو راستبازی کو پسند کرتا ہوں لیکن جن لوگوں نے اس ابتدائی سبق کو قبول نہ کیا وہ اعلےٰ درجہ کے سبقوں کے لائق ثابت نہ ہوئے۔ اسرائیل کے درمیان اس قسم کے لوگ موجود تھے جو اُن باتوں کے سیکھنے کے قابل تھے جو خدا سکھانا چاہتا تھا۔ انکی طبائع اور ارواح خدا کے ساتھ ہمدردی رکھتی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ مکاشفہ کی مضبوطی اور صحت کے لئے الہام کی ضرورت تھی یعنی مکاشفہ کے ظہور کے لئے ایسے آدمیوں کی ضرورت تھی جن میں خدا کی روح اس درجہ تک موجود ہو کہ وہ اُس کے اظہار کو جو نیچر میں یا تاریخ میں یا مسیح میں ہو پہچان کر نہ صرف اُس کی قدر کر سکیں بلکہ اُسے قبول بھی کر سکیں۔ دوسری ضروری بات یہ تھی کہ اگر یہ بھی منظور ہو کہ خدا کے کشف کا عرفان اور اُس عرفان کی قدر جو خدا کے بندوں نے کی تمام بنی آدم کی میراث بن جائے تو اُس مکاشفہ کا حال قلمبند کیا جائے؂

اب صاف ظاہر ہے کہ بیان مذکورہ بالا سے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں اوّل یہ کہ اگر مکاشفہ کو اپنا مقصد پورا کرنا ہو تو لازمی امر ہے کہ وہ اُن کو عطا کیا جائے جو اُسکے سمجھنے کی لیاقت رکھتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر اُسے ہمیشہ قائم رکھنا ہو تو ضرور ہے کہ وہ ثبت کیا جائے؂

دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ دو غور طلب خیال پیدا ہوتے ہیں جن پر کچھ دیر تک بحث کرنا لازمی امر معلوم ہوتا ہے (۱) مکاشفہ کا بتدریج ترقی پکڑنا (۲) اُس کا قید کتابت میں لایا جانا؂

(۱) لازمی امر ہے کہ مکاشفہ بتدریج ترقی کرے کیونکہ ضرور ہے کہ اُس بیا اور اُن لوگوں کی حالت میں جن کو وہ دیا جاتا ہے ایک قسم کی مطابقت ہو۔

اُن لوگوں کے نزدیک جو ڈِی اسٹ کہلاتے ہیں یہی ایک مشکل تھی جس کا حل کرنا انہیں غیر ممکن معلوم ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ خدا نے پہلے ہی سے اپنے آپکو مسیح میں ظاہر کیوں نہ کیا؟ آدم کے گرنے کے بعد ہی اُس نے اپنے فضل کے طریقے کو آشکارا کیوں نہ کیا؟ اور ہمارے زمانہ میں بھی پُرانے عہد نامہ کے اخلاق پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ناکامل ہیں۔ اور یہ قباحت وہی قباحت ہے جس نے دوسری صدی میں سر اُٹھایا تھا جبکہ بہت سے لوگوں نے جو ناسٹک کہلاتے تھے ٹھوکر کھائی اور کہا کہ جو خدا پُرانے عہد نامہ میں نظر آتا ہے وہ تو بالکل ایک مختلف قسم کا خدا ہے۔ لیکن یہ تمام مشکلات کافور ہو جاتی ہیں جب ہم اس بات کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ جیسی لوگوں کی حالت ہوتی تھی اُسی کے مطابق خدا اپنے کشف سے اپنے بندوں کو مالا مال فرماتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ بچپن کے زمانہ میں بنی آدم کو وہ عرفان بخشا جاتا جو جوانی کے لائق تھا ؎

ایک شخص پلاٹینس نامی گزرے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ "جو شخص خدا کو دیکھنا چاہے اُسکے لئے ضرور ہے کہ وہ خدا کی مانند بنے" اس مقولہ میں وہ اصول مخفی ہے جسے اس مسئلے کی بُنیاد کہنا چاہیئے۔ کہا کرتے ہیں کہ "اخلاقی موافقت شخصی تعارف کی جڑ ہے۔ کوئی شخص اُس سیرت کو سمجھ نہیں سکتا جس کے ساتھ خود اُس کی طبیعت کی موافقت نہیں ہوتی" جو لوگ ہماری مانند نہیں ہیں وہ ہمارے حالات و خواص کو مطلق نہیں سمجھ سکتے۔ یہی حال خدا کا ہے۔ وہ بھی اُن لوگوں پر اپنے تئیں ظاہر نہیں کر سکتا جو اُس کی الٰہی طبیعت سے کچھ موافقت نہیں رکھتے۔ وہ شخص جو خود غرضی کی آلائش سے صاف اور محبت کے خیالات سے پُر ہے اگر ایسے لوگوں کے درمیان چلا جائے جن کے دلوں کو بدی نے سخت کر دیا ہے اور جو محبت سے بالکل بے بہرہ ہیں تو اندیشہ ہے کہ پہلے پہل وہ اُس کی محبت کی باتوں کو ذرا بھی نہ سمجھینگے۔ وہ فقط رفتہ رفتہ اپنی محبت بھری سیرت سے اُن لوگوں کو آگاہ کر سکیگا۔ شروع شروع میں لوگ اُس پر شک کرینگے۔ اُس کے خیالات اور ارادت کی غلط تاویل کی جائیگی۔ یہی

حال الٰہی مکاشفہ کا ہوا یعنی جوں جوں لوگ اس قابل ہوتے گئے کہ خدا کی ہیئت کی اعلےٰ اور الٰہی صفات کو پہچانیں اور اُن کی قدر کریں توں توں خدا اُن پر اپنے آپ کو ظاہر کرتا گیا واضح ہو کہ خدا کی محبت بخوبی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی جبتک کہ اُس کی راستی اور پاکیزگی اچھی طرح سمجھ میں نہ آجاتی۔ مسیح کا مرنا بے سود ہوتا اگر بنی آدم اس بات کو نہ سمجھتے کہ پاکیزگی اور راستی خدا کی ذاتی صفات ہیں اور جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اُس کی اُس محبت کی گہرائی جس نے اُسے بنی آدم کے لئے قربان ہونے کو تیار کر دیا اچھی طرح سمجھ میں آگئی اور نیز لوگوں نے اُسکی بیش بہا عظمت کی قدر کرنا سیکھ لیا۔

یہی خیال پُرانے عہدنامہ کی اخلاقی باتوں پر صادق آتا ہے۔ یہ ضروری امر تھا کہ مورلیٹی (اخلاق) منزل بہ منزل آگے بڑھے اور تمام آرائشوں سے صاف ہوتی جاوے اور اگر ہم یہ دریافت کرنا چاہیں کہ آیا وہ باتیں جو پُرانے عہدنامہ میں درج ہیں الٰہی طریق کے مطابق ہیں یا نہیں تو ہمیں یہ نہیں پوچھنا چاہئے کہ کشف الٰہی کے طریق کی ابتدائی منازل کیا تھیں بلکہ یہ پوچھنا چاہیئے کہ جس طرز اور طریق سے خدا نے پُرانے عہدنامہ میں کام لیا اُس کا نتیجہ بالآخر کیا ہوا؟ اکثر یہ اعتراض سُننے میں آتا ہے کہ بعض بعض اشخاص شلاً ابراہیم اور داؤد جن کو الہام کی برکت عطا ہوئی جھوٹ یا دیگر گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس سے کتاب کی صداقت ثابت ہوتی ہے نہ کہ مکاشفے کی تکذیب۔ چونکہ مکاشفہ اسی قدر دیا گیا جسقدر لوگوں میں اُس کے قبول کرنے کی سمائی تھی اور چونکہ اس کا انجام آخر کار یہ ہوا کہ لوگ اخلاق کے ادنےٰ درجہ سے اعلےٰ درجہ تک پہنچ گئے۔ لہذا الہام کا تدریجی طریقہ جو خدا نے پرانے عہدنامہ میں اختیار کیا سراسر واجب تھا۔

مگر چونکہ اس بات کے متعلق اکثر غلط فہمیاں ہوتی رہتی ہیں اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُن غلط فہمیوں کی مدافعت کے لئے چند الفاظ اور اضافہ کریں۔ پرانے عہدنامہ میں نہ صرف بداخلاقیوں کا ذکر آتا ہے (اور

کامل اور سچی تاریخ میں ایسی باتوں کا مذکور ضرور ہوگا) اُس میں ایسے واقعات بھی قلمبند ہیں جن کی اجازت خدا نے اُس وقت دی مگر نئے عہدنامہ میں اُس قسم کے افعال پر فتوے لگایا ہے۔ مثلاً بردہ فروشی۔ کثیرالازواجی۔ کنعانیوں اور بعل کے کاہنوں کو قتل کرنا۔ معصوم بچوں کو اُن کے مجرم ماں باپ کے ساتھ ملک عدم کو پہنچانا۔ بعض بعض دُعائیہ زبوروں میں ایسے فقروں اور عبارتوں کا آنا جن سے سختی اور انتقام کی آرزو کی بو آتی ہے۔ یہ سب باتیں عموماً بائیبل کے پڑھنے والوں کے لئے ٹھوکر کا باعث ہوئی ہیں ❊

اس کے برخلاف منکروں کی دلیل بڑی مختصر سی ہے جو کہ یوں ادا کی جاسکتی ہے " یہ کتاب الہی الاصل ہونے کا دعوے کرتی ہے۔ مگر جب ہم اس کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے افعال کو جائز ٹھیراتی ہے جو خارج از دائرۂ اخلاق ہیں لہذا یہ کتاب من جانب اللہ نہیں ہے۔ پس اس کا من جانب اللہ ہونے کا دعوے غلط ہے اور ہمیں اس کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیئے" ❊

اس دلیل کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ یہ دلیل فقط اُس زمانہ میں کچھ زور رکھتی تھی جب بائیبل کے متعلق وہ دعوے کئے جاتے تھے جو درست نہ تھے اور نہ وہ طریقے ہی ٹھیک تھے جن کے وسیلے سے وہ دعوے پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن بائیبل کے اصل دعوے اور خدا کے مکاشفے کے صحیح تصور کے خلاف اس دلیل کا کچھ زور نہیں چلتا۔ پُرانا عہدنامہ اُس قوم کی ایک سچی تاریخ ہے جو تیار کی جارہی تھی کہ خدا کو پہچانے اور راستی کو پیار کرے۔ عین اس کے مطابق ہمیں اُن کی ترقی کی مختلف منازل صاف صاف نظر آتی ہیں۔ اس قوم کے رہنما خدا کے سچے اور وفادار خدمتگزار تھے۔ اُس کے ساتھ سچی رفاقت رکھتے تھے۔ مگر انہیں اس کا پُورا پُورا علم نہ تھا۔ مگر وہ اُس کامل علم کی طرف جو مسیح کے ظہور کے ساتھ وجود میں آیا ترقی کرتے جاتے تھے۔ وہ خدا کی ذات کے متعلق فقط اُسی قدر سمجھ سکتے تھے جس قدر سمجھنے کی گنجائش اُن کی سمجھ میں پائی جاتی تھی اُن کا حال انسانی زندگی کی نشوونما کے قاعدوں کے ساتھ مشابہت رکھتا تھا۔

جس طرح بچّہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے مدارج عمر کے مطابق اپنے باپ کے اوصاف اور خواص کو سمجھتا جاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ جس طرح چھٹپن میں بچّہ اپنے باپ کی خصلت کو کُلّی طور پر نہیں سمجھ سکتا اسی طرح یہ لوگ بھی خدا کی ذات کی حقیقتوں کو شروع میں پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ان تمام نقصوں کو جو خدا کے علم میں پائے جاتے ہیں بائبل جو کہ ایک سچّی اور معتبر تاریخ ہے بلا کم وکاست پیش کرتی ہے۔ اور ہم اُسکے اوراق کے مطالعہ سے سیکھتے ہیں کہ یہودیوں کے درمیان جو سب سے اچھے اشخاص تھے وہ بھی خدا کے علم میں کامل نہ تھے۔ وہ باتیں جو اس علم میں بھدّی اور نازیبا تھیں وہ اسی نسبت سے رفتہ رفتہ دُور ہوتی گئیں جس نسبت سے یہ لوگ خدا کی شریعت کی تابعداری کرتے رہے اور اُس کی رفاقت کی دُھن میں لگے رہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئیے کہ ہمیں وہ باتیں جو ناقص سی نظر آتی ہیں اور جنکے سبب سے اُن کی تیاری کا پہلا حصہ بدنما سا معلوم ہوتا ہے دیکھنا نہیں چاہئیے۔ جس بات پر ہمیں اپنی توجہ لگانی چاہئیے وہ وہ ترقّی ہے جس نے تمام نقصوں کو پیچھے چھوڑ کر اپنا قدم کمال کی طرف اُٹھایا اور یوں خدا کے تربیت کرنے والے ہاتھ اور اُس کی روح کی حکمت کو راست ثابت کیا۔ پُرانے عہد نامہ کی تعلیمات کو علم الٰہی اور راستی کی آخری منزل گردانتا اور اُسے تیاری کا پہلا حصہ نہ سمجھنا سخت غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہاں خدا کے کشف کے ہر حصّہ کو جُداگانہ نظر سے دیکھنا اور اُسے ماقبل اور مابعد کے واقعات اور حالات سے علیحدہ کر کے اُس پر فتوے لگانا واقعی ایک غلطی میں ڈوب جانا ہے۔ اگر ہم الٰہی مکاشفہ یا پُرانے عہد نامہ کا صحیح موازنہ کرنا چاہیں تو اس بات کو نہ بھولیں کہ کشفِ الٰہی اُس نور کی مانند تھا جو صبح صادق سے شروع ہو کر مہر نیم روز کی کامل روشنی تک پہنچ جاتا ہے۔ اور کہ گو اُن اشخاص میں سے جو الہام کی ابتدائی منزل میں موجود تھے بہت سے ایسے تھے جو مابعد کے بزرگوں کی طرح خدا پر بھروسہ رکھنے اور کمال وفاداری سے اُسکی خدمت بجالاتے تھے تاہم وہ خدا کا عرفان اس درجہ تک نہیں رکھتے تھے جیسا کہ وہ رکھتے تھے جو اُن کے بعد اس دُنیا میں آئے۔ ابتدائی زمانہ کے بزرگ بعد کے نبیوں کی طرح خدا کی ذات وصفات کا علم نہیں رکھ سکتے تھے

پس ظاہر ہے کہ بائبل کے مخالف کی دلیل جب پُرانے عہد نامہ کے صحیح تصوّر کے سامنے آتی ہے تو تاب مقاومت لا کر فرار ہو جاتی ہے۔ وہ منکر جو ایک نہایت بھدے طور پر فقط وہی باتیں پُرانے عہد نامہ سے چُن لیتا ہے جن سے ضمیر کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اور اُنہیں ایماندار کے سامنے رکھکر طنزاً کہتا ہے "دیکھو یہ ہے تمہارا خدا۔ جو علانیہ انتقام کو پسند کرتا ہے"۔ وہ کلام الٰہی کے بھید سے واقف نہیں۔ اور اسی طرح وہ ایماندار بھی غلطی پر ہے جو کسی منکر کی بیہودہ باتیں سُن کر اپنے دل میں کہنے لگ جاتا ہے۔ کاشکہ یہ باتیں کلام میں نہ ہوتیں۔ خدا اپنی ذات وصفات کا ایک ایک خیال اور ایک ایک خط لوگوں کی سمجھ کی قابلیت کے مطابق ظاہر کرتا رہا۔ علم کے جس اعلیٰ زینہ تک یہودیوں کو پہنچانا خدا کو منظور تھا اُس نے اُنہیں اُس بلندی پر معجزانہ طور پر نہیں پہنچایا۔ جو عرفان وہ اُنہیں اُن کی قومی تاریخ کے وسیلے اور نیز اُس تاریخ پر غور کرنے کے وسیلے سے پہنچانا چاہتا تھا۔ اُس نے اُس عرفان کو بجلی کے شعشہ کی طرح ایک دم میں ظاہر نہیں کیا۔ اُس نے اپنے تئیں اُن پر اُن کی قومی تاریخ کے وسیلے ظاہر فرمایا یعنی بوسیلہ اُن سلوکوں کے جو وہ اُن کے ساتھ اُن کی بغاوت اور توبہ کے وقت کرتا رہا۔ وہ اُن کے غلط تصوّرات کے دُور کرنے کے لئے عجلت میں نہ تھا۔ لہذا اُس کے وہ بندے اُسی قدر اُس میں دیکھتے تھے جس قدر دیکھنے کی قابلیت اُن میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور اُسکو زیادہ جاننے اور دیکھنے کی شرط یہی تھی کہ جتنا علم اُن کو حاصل ہو چکا تھا اُسکے مطابق اُسکی خدمت بجا لائیں۔ اس جگہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر پُرانے عہد نامہ میں ان بزرگوں کے غلط اور صحیح دونوں طرح کے تصوّرات موجود ہیں تو ہم کس طرح اُن میں امتیاز کریں۔ اور یہ کہیں کہ یہ درست ہے لہذا ماننے کے قابل ہے۔ اور یہ نادرست ہے لہذا اسے ترک کرنا چاہئے۔ اس معاملہ میں مسیح اور مسیح کی تعلیم ہمارے لئے معیار کا کام دینگے۔ وہ کامل مکاشفہ باپ کا جو مسیح میں پایا جاتا ہے وہ میزان ہے جسکے وسیلے سے ہم اُس کو جو ناکامل ہے دریافت کر لیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ کامل نتیجہ کے وسیلے ہم اُس سارے عمل کے ایک ایک حصّہ کی کُنہ کو جان لیتے ہیں جسکے ذریعے سے وہ نتیجہ پیدا ہوا ہے۔ اگر آپ سٹیم انجن یا نقاشی یا برقیات یا نجوم یا کسی اور علم کی

پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ ہر علم میں تحقیق قدم بقدم آگے بڑھی ہے۔ آپ دیکھینگے کہ غلطیاں ہمیشہ صحیح تصورات کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں جنکے سبب سے اصل نتیجہ بارہا جلدی وجود میں نہیں آیا بلکہ اکثر رُکا رہا۔ جب کوئی مورخ کسی ایجاد یا دریافت کی لمبی چوڑی تاریخ پر سے عبور کرتا ہے تو وہ سہو و غلطی کی طرف بہت متوجہ نہیں ہوتا۔ وہ اُس ترقی کے رشتہ کی پیروی کرتا ہے جس سے پُرانے اور نئے زمانہ کے محقق مربوط ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح کوئی زمانۂ حال کا منجم اُن غلطیوں میں گرفتار ہونا پسند نہیں کرتا۔ جو قدیم زمانہ میں آفتاب کی حرکت کے متعلق رائج تھیں اور نہ کوئی ایسا انجنیئر ہی ہے جو اس وقت کسی مشین سے کام لے رہا ہے۔ جو اُن خیالوں میں مبتلا ہو رہا ہے۔ جو زمانہ سلف کے محققین بھاپ کے متعلق مانتے تھے۔ اور نہ کوئی دانا شخص دیکھنے میں آئیگا جو اُن لوگوں پر لعن طعن کرتا ہو۔ جو پچھلے ایام میں کسی سائنس پر غور و فکر کرتے تھے اور اُن کے نتیجوں اور خیالوں میں غلطیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اس قسم کے پرانے اشخاص ہمارے موجودہ علم کے لئے نہایت ضروری تھے۔ البتہ الٰہی حقیقت کے دریافت کرنے کے متعلق ایک طرح کا فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ خدا نے اپنے آپ کو خود انسان پر ظاہر کیا اور انسان کو دریافت کرنے کی ذاتی طاقتوں پر نہیں چھوڑا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ خدا انسان پر اپنے تئیں اسی قدر ظاہر کر سکتا تھا جس قدر اس میں پہچاننے کی قابلیت تھی۔ یہ پہچاننے کی قابلیت انسان کی سمجھ کی تواریخی ترقی پر موقوف تھی۔ پس پُرانے عہدنامہ کے بزرگوں کے خیالات اور افعال کی نکتہ چینی کرنا اور انہیں حقارت سے دیکھنا ایک طرح سے اپنے روحانی آبا و اجداد کا خون کرنا ہے۔ ایسا کرنا گویا اس چٹان کو نظرانداز کرنا ہے جس میں سے ہم تراشے گئے ہیں۔ یا یوں کہیں کہ اُن قدیمی بڑے بڑے پیشواؤں کی حقارت کرنا ہے جن کی طفیل سے ہمارے موجودہ علم نے وجود کی صورت دیکھی۔

چونکہ خدائے تعالیٰ کا اپنے مکاشفہ سے یہ منشا تھا کہ بنی آدم کو گناہ اور اُسکے نتائج سے نجات بخشے اس لئے اُس مکاشفے کی تاریخ کا قلمبند کیا جانا اگر لازم نہیں تو مناسب تو ضرور ہی تھا۔ بیشک بٹلر صاحب نے ایک جگہ کچھ کچھ یوں کہا ہے کہ

"ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ خدا کے مکاشفے کو قلمبند ہونا تھا یا بصورت روایت متداول ہو کر نسلاً بعد نسلِ بنی آدم کو پہنچنا تھا اور یوں تقریری روایت کے سبب سے اپنی خالقیت کو کھو کر آخر کار مفقود ہو جاتا تھا۔ شاید کوئی یہ کہے کہ اگر مکاشفہ قلمبند نہ کیا جاتا اور تحریر کے وسیلے بگڑنے سے محفوظ نہ رکھا جاتا تو اپنے مقاصد کو پورا نہ کرتا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون سے مقاصد تھے جو عدم تحریر کی حالت میں اُس سے پُورے نہ ہوتے۔ شاید اُس حالت میں اُس سے وہ اغراض پُوری نہ ہوتیں جو اَب ہو رہی ہیں۔ اور شاید یہ بھی ممکن ہے کہ اُس درجہ تک پوری نہ ہوتیں جس درجہ تک اب ہو رہی ہیں تاہم اس میں شک نہیں کہ اُس سے اور کئی اغراض پوری ہوتیں یا شاید وہی اغراض پوری ہوتیں جو اَب ہو رہی ہیں گو مختلف اندازہ میں پوری ہوتیں۔ مگر ہم پہلے ہی سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ اُن اغراض میں سے کونسی خدا کی وہ اغراض ہیں جو اُس کی عام حکومت کے ساتھ پُوری پُوری مطابقت رکھتی ہیں"۔ یہ بٹلر صاحب کے خیال کا خلاصہ مطلب ہے۔ اور یہ خیال ایک طرح بڑا فائدہ مند بھی ہے۔ ہم بڑی عجلت سے کہنے لگ جاتے ہیں۔ خدا کا یہ مقصد تھا اور خدا کا وہ مقصد تھا۔ اب بٹلر صاحب کے اس بیان سے ہم خدا کے مقاصد پر جلد بازی سے رائے زنی کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ اور نیز ہم کو اس خیال کے وسیلے یہ روشنی ملتی ہے کہ مکاشفہ ایک اَور بات ہے اور اُسے قلمبند کرنا ایک اَور بات ہے۔ اور کہ ممکن ہے کہ کبھی ایسا کشف بھی ہوا ہو جو کبھی قلمبند نہیں کیا گیا۔ اور یہ ایک واقعی امر ہے کہ خدا کی ذات وصفات کا بہت سا مکاشفہ ثبت نہیں ہوا ہے۔ بہت سا ظہور اُس کی ذات وصفات کا فطرت میں ہو رہا ہے جو اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ اور جو کچھ اُس کی نسبت اب تک تواریخ میں ظاہر ہوا ہے وہ بہت ہی کم ہم نے محسوس کیا ہے بلکہ ہمیں یوں کہنا چاہیئے کہ جو کشف مسیح کی ذات میں ہوا ہے وہ بھی پُورے پُورے طور پر رقم نہیں ہوا ہے۔ اب گو یہ ساری باتیں ایک طرح سچ ہیں تو بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ شروع شروع میں اس بات کی نبوت کرنا کہ بعد میں الٰہی مکاشفہ کا کیا حال ہوگا اپنے حدود سے تجاوز کرنا ہوتا تاہم اب جبکہ ہم خدا کے مکاشفے کو

پُورے پُورے طور پر لکھا ہوا پاتے ہیں تو اُس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اُس کے قلمبند کئے جانے سے بہت فائدہ ہوا نادرست نہیں ہے۔ اس فائدے کی تشریح ویسٹ منسٹر کنفیشن میں بہت اچھی طرح کی گئی ہے۔ چنانچہ اُس میں لکھا ہے "اگرچہ نیچر کی روشنی اور خلقت کی آفرینش اور پروردگاری کے کام خدا کی رحمت اور حکمت اور قدرت کو اس درجہ تک ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کے پاس انکار کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہتا تاہم اُن سے خدا کا اور اُس کی مرضی کا وہ علم دستیاب نہیں ہوتا جو نجات کے لئے ضروری ہے۔ لہذا خدا نے تو ... ے کو پسند آیا کہ متفرق زمانوں میں طرح بہ طرح اپنے آپکو ظاہر فرمائے اور اپنی اُس مرضی کو جو نجات کے لئے ضروری ہے کلیسیا پر آشکارا کرے۔ پھر اُس کو یہ بھی پسند آیا کہ سچائی کی حفاظت اور اشاعت کے لئے۔ اور کلیسیا کو جسمانی خرابیوں اور شیطان کی عداوت اور دُنیا کے کینے سے بچانے کے لئے اپنے مکاشفے کے کل واقعات کو قلمبند کردے۔ اس سے پاک نوشتوں کا وجود ضروری اور لابدی بن جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے وہ قدیم طریقے جن سے وہ اپنی مرضی کو ظاہر فرمایا کرتا تھا اب مفقود ہو گئے ہیں"۔ اسی طرح ایک شخص (Rothe) نامی کہتا ہے کہ "ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مکاشفہ کے متعلق جو بات غور طلب ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ فقط اُسی حلقہ میں اپنی تاثیروں کو محدود رکھتا ہے جس حلقہ میں پہلے پہل اُس کا اثر اپنا کام شروع کرتا ہے بلکہ اصل بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ جو حقیقتیں اُس میں پائی جاتی ہیں وہ ہمیشہ انسان کے عقلی دائرہ میں موجود رہینگی تاکہ بنی آدم کے تصورات اور تجارب کے گورکھدھندے میں ایک ضروری اصول معلومہ کا کام دیں۔ مکاشفہ کے وسیلے وہ سچے واقعات جو انسانی دُنیا کے لازمی عناصر ہیں دُنیا میں داخل ہوتے ہیں۔ دُنیا اُنہیں خود کبھی دریافت نہ کرسکتی"۔

اب اس سے صاف ظاہر ہے کہ مکاشفہ اُن مقاصد کو پُورا نہ کرسکتا جو وہ کر رہا ہے اگر وہ سلک تحریر میں منسلک نہ کیا جاتا۔ اور اس کی دلیلیں یہ ہیں۔ اوّل تو یہ سمجھنا ہی مشکل ہے کہ اگر مکاشفہ تحریر نہ کیا جاتا تو وہ کس طرح کمال کو پہنچتا کیونکہ الٰہی مکاشفہ جیسا ہم اُوپر عرض کرچکے ہیں ایک تواریخی امر تھا اور یوں لمبے لمبے زمانوں

پر چھایا ہوا تھا" یہ ضروری امر تھا کہ ایک پشت دوسری پشت کو بتلائے کہ خدا نے کونسی صداقتیں ظاہر فرمائی ہیں اور کونسے کام نجات کے متعلق انجام دئے ہیں"
علاوہ بریں ہم دیکھتے ہیں کہ نبیوں کے کلام کا دارومدار اُس شریعت پر تھا جو پہلے عطا کی جا چکی تھی۔ یا وہ ان تواریخی واقعات کا حوالہ دیتے تھے جو پہلے وقوع میں آچکے تھے۔ اب وہ ایسا کب کر سکتے اگر شریعت اور تاریخ لکھی ہوئی نہ ہوتی۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نئے عہدنامے کے مصنف تصنیف کے کام میں اُس علم سے جو وہ پُرانے عہدنامہ کے متعلق رکھتے تھے بہت سی مدد پاتے تھے۔ اب سوائے اسکے کہ پہلے مکاشفے رقم کئے جاتے اور کسی طرح مکاشفے کے کام کا متواتر جاری رہنا اور بتدریج ترقی کرنا قیاس میں نہیں آسکتا تھا۔ پروفیسر لیڈ (Ladd) صاحب درست فرماتے ہیں کہ " بائیبل کا مکاشفہ کسی بے ربط صورت میں نہیں بخشا گیا۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ اگر جی میں آیا تو تھوڑا سا دیدیا ورنہ خیر۔ نہیں اُس میں تو تواریخی سلسلہ پایا جاتا ہے۔ اور یادداشت جسقدر ایک بشر کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اسی قدر نی آدم کے سارے گروہ کے لئے ضروری ہے۔ یہی بات تواریخی مکاشفہ کے ساتھ شیر و شکر کا سا رشتہ رکھتی ہے کہ خدا کی باتوں اور ہدایتوں کا جمع کیا ہوا (یعنی لکھا ہوا) سرمایہ موجود رہے +

دوم یہ بات بھی صاف ہے کہ اگر کلام لکھا ہی جاتا تو جب ہی خدائے نجات دہندہ کا وہ علم جو اُس نے عنایت فرمایا ہے محفوظ رہتا اور اشاعت پاتا۔ اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہے کہ خدا انسان سے کیسا رشتہ رکھتا ہے۔ اور کہ مسیحی مذہب کیا ہے۔ اور نیز وہ واقعات اور صداقتیں کیا ہیں جنپر مسیحی مذہب اور وہ مسائل مبنی ہیں جو مسیحی مذہب کی تعلیمات میں داخل ہیں۔ یا اگر اس بات پر بحث برپا ہو کہ انسان کو کس بات یا کس شخص پر ایمان لانا چاہئے تو ضرور ہے کہ ان باتوں پر روشنی حاصل کرنے کے لئے ہم بائیبل کے پاس جائیں۔ پس ہم عام صورت میں اور سچائی کے ساتھ بائیبل کو خدا کا مکاشفہ کہہ سکتے ہیں +

خلاصہ۔ جو کچھ اُوپر عرض کیا گیا ہے اُس سے بخوبی ظاہر ہوگیا ہوگا کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے آپ کو ہم پر نجات کے کام میں ظاہر فرمایا ہے۔

جو کچھ خدا نے انسان کو اپنی قربت میں لانے اور گناہ کے پنجہ سے چھڑانے کے متعلق کیا ہے ہم اُسی میں اُس کو دیکھتے ہیں۔ اُسی میں اُس کی سیرت اور مقاصد کا نظارہ ہمیں نصیب ہوتا ہے۔ خدا کے اس کام کی لکھی ہوئی تاریخ بائیبل میں موجود ہے یعنی اُس میں اُس کے نجات بخش اور فضل سے معمور کام اور مقاصد کا حال قلمبند ہے۔ بائیبل کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ تعلیمات کا ایک آسان سا مجموعہ یا خلاصہ ہے یا کہ وہ علوم الٰہیات کی ایک ٹیکسٹ بُک ہے اُسکی حقیقت کا ایک غلط موازنہ کرنا ہے" اگر ہم خدا کے متعلق یا خدا کے اُس رشتہ کے متعلق جو وہ انسان کے ساتھ رکھتا ہے سچائیوں کا کوئی مسلسل سلسلہ اخذ کرنا چاہیں تو ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو ایک اسٹرانومر (منجم) اجرام فلکی سے اسٹرانومی کی سسٹم قائم کرتے وقت اختیار کرتا ہے۔ یا جس طرح کوئی امبری آلوجسٹ (Embryologist) وہ جو اُس وقت بچہ کی حالت پر غور کرتا ہے جب کہ وہ محض ایک مضغہ سا ہوتا ہے) مضغہ کی فطری ترقی کا ملاحظہ کرکے اپنا کامل علم حاصل کرتا ہے۔ خدا نے اپنے تئیں ظاہر کر دیا ہے اور اُس کے مکاشفے کی بڑی بڑی صداقتیں ہمارے لئے بائیبل میں قلمبند ہیں۔ اور ان صداقتوں کے وسیلے ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے کہ ہم اُس کی نسبت جانیں اور سوچیں۔ بائیبل کے متعلق ہمیں کبھی یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ وہ ایک ایسی صداقتوں کا مجموعہ ہے جو سوالوں یا مسئلوں کی صورت میں قلمبند کی گئی ہیں اور جو خدا نے وقتاً فوقتاً بعض آدمیوں کے کانوں میں پھونک دی تھیں تاکہ وہ اُنہیں دُنیا کے حوالے کریں اور دُنیا اُنہیں ہر زمانہ میں خیال اور زندگی کے بے بدل قاعدے (Formulas) سمجھے۔

اس سے ہمیں الہام کا صحیح مطلب بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے اس مکاشفہ کو فقط وہی لوگ سمجھ سکتے اور وہی اس کی قدر کر سکتے ہیں جو اُسکی روح سے مالا مال ہیں یا یوں کہیں کہ مکاشفہ کو قبول کرنے کے لئے ملہم اشخاص کا ہونا لازمی امر ہے۔ الہام مکاشفہ کا تکملہ ہے جس طرح بصارت کا وجود خارجی دُنیا

کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اُسی طرح الہام کی نظر خدا کی باتوں کو پہچاننے اور قبول کرنے کے واسطے لازمی ہے۔ انسان میں الہام وہ طاقت ہے جو خدا کے مکاشفے کو محسوس کرتی۔ اُس کی خوبیوں کی قدر کرتی۔ اُسے قبول کرتی اور بعض حالتوں میں اُسے قلمبند بھی کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ مکاشفہ ایسی جگہ جھلک دکھائے جہاں اس کے محسوس کرنے کے لئے الہام یافتہ اشخاص موجود نہ ہوں۔ جس طرح کہ سلسلۂ نیچر میں بہت سی چیزیں ایسی جگھوں میں موجود ہیں جہاں کوئی آنکھ اُس کے دیکھنے کو حاضر نہیں ہے۔ ہاں خدا نے بارہا اپنے آپ کو ظاہر فرمایا مگر اُس ظہور کے پہچاننے اور قبول کرنے کے لئے کوئی ملہم شخص موجود نہ تھا۔ اور اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے بہت سے ایسے اظہارات ہوئے ہیں جنہیں ملہم لوگوں نے محسوس کیا مگر وہ کبھی قلمبند نہ کئے گئے۔ بائیبل میں ہمارے لئے وہ چیدہ مکاشفات ثبت کئے گئے ہیں جنہیں ملہم اشخاص نے قبول کیا اور پھر رقم کرنا بھی مناسب سمجھا۔

پانچواں باب

اِلہام

تین باتیں ہمارے دل میں جُدا جُدا صورت میں اور صاف صاف طور پر نقش ہو جانی چاہئیں۔ اوّل خدا کا اپنے آپ کو ظاہر فرمانا۔ دوم انسان کا اُس اظہار یا کشف کو محسوس کرنا۔ سوم اس انکشاف محسوسہ کا ہماری بائیبل میں قلمبند کیا جانا۔ یہ ناممکن تھا کہ خدا اپنے آپ کو ایسے طور پر ظاہر فرمائے جیسا کہ اُس نے مسیح میں ظاہر فرمایا اور اُس ظہور کو ادراک کرنے کے لئے کوئی شخص بھی تیار نہ ہو۔ ماسوائے اس کے یہ بات مُدت سے انسان کے وتیرہ میں داخل ہو گئی ہے کہ جو اشیاء اور واقعات اُس کو موثر کیا کرتے ہیں وہ عموماً انہیں قید کتابت میں لے آتا ہے۔ لہذا یہ بات اُس کی فطرت کے عین مطابق تھی کہ وہ اظہارات الٰہیہ کی ویدہی پر

اکتفا نہ کرے بلکہ اُنہیں رقم بھی کر دالے۔ اب اگر ہم ان تین باتوں کو اپنے ذہن میں غلط ملط نہ ہونے دیں بلکہ جُدا جُدا رکھیں تو ہمیں بائبل کی خاصیت اور کام کا صاف صاف پتہ لگ جائیگا۔ بائبل کے وجود میں آنے سے پیشتر بھی خدا اپنے آپ کو نجات بخش صورت میں اپنے بندوں پر ظاہر کیا کرتا تھا۔ مگر یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ وہ اب فقط بائبل ہی کے وسیلے سے اپنی نجات کا علم بنی آدم کو پہنچاتا ہے۔ خدا نے نئے عہدنامہ کے وجود میں آنے سے کہیں پیشتر اپنے آپکو مسیح میں ظاہر فرمایا اور بنی آدم کو بچایا۔ مگر اب اپنے اُس مکاشفہ اور ظہور کے فواید وہ اناجیل اور خطوط ہی کے وسیلے سے ایک قائم دائم صورت میں بنی آدم کو پہنچاتا ہے! اسی لئے نوشتوں کی نسبت کہا گیا ہے کہ "خدا جیسا مسیح میں ظاہر ہوا ہے ویسا اُنہی میں کلیسیا کے ایمان اور دُنیا کی پہچان کے لئے موجود ہے۔ وہ مسیح کی پہچان کو ایسی شخصیت اور ایسی بقا اور ایسی عالمگیری سے ممتاز کر دیتے ہیں کہ اُس کا علم ہر جگہ اور ہر حالت میں اپنا خالقانہ اور انسان کو اُس کی اصل حالت پر لانے والا عمل جاری رکھتا ہے"۔ اب اس سے ظاہر ہے کہ بائبل خدا کا مکاشفہ اس لئے کہلاتی ہے کہ جو کچھ خدا نے اپنی ذات و صفات کے انکشاف کے لئے کیا ہے اور جو کچھ خدا کے الہام یافتہ بندوں نے اُس انکشاف میں خدا کی نسبت دیکھا اور سوچا ہے ہمارے سامنے لکھی ہوئی صورت میں لاتی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس لیاقت کی نسبت جس سے انسان خدا کے مکاشفہ کو سمجھتا اور رقم کرتا ہے ہم کچھ زیادہ شرح و بسط کے ساتھ تحریر کریں۔ اس لیاقت کو الہام کہتے ہیں۔ اس جگہ الہام یونانی لفظ θεόπνευστια (تھیوپنیوستیا) کا ترجمہ ہے۔ نوشتوں کا الہامی ہونا مرقومۂ ذیل وجوہات کے سبب سے مانا گیا ہے۔ (۱) پہلی وجہ کا ذکر کچھ کچھ اُوپر ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ کشف الٰہی کے سمجھنے کے لئے خدا کی روح کا باطن میں موجود ہونا ضروری امر ہے۔ روحانی باتیں روحانی طور پر دریافت کی جاسکتی ہیں۔ اسی لئے ہمارے خداوند نے اور چیزوں کی نسبت روح کے نزول کا ذکر زیادہ خصوصیت اور زور کے ساتھ کیا ہے تاکہ اُسکے

شاگرد جان لیں کہ خدا نے اُس میں کیا کچھ ظاہر فرمایا ہے۔ (۲) دوسری یہ وجہ ہے
کہ نئے عہدنامہ میں پُرانے عہدنامہ کا الہامی ہونا مانا گیا ہے حالانکہ پُرانے عہدنامہ
کے مصنّفوں میں سے ہر ایک مصنّف اپنے ملہم ہونے کا دعوےٰ نہیں کرتا ۔
مثلاً ۲ تمطاؤس ۳ : ۱۶ میں نوشتوں کے الہامی ہونے کا دعوےٰ کیا گیا ہے۔
خواہ ہم اس آیت کے لفظوں کا کچھ ہی مطلب کیوں نہ سمجھیں۔ پھر ۲ پطرس ۱ : ۲۱
میں ہم یہ سیکھتے ہیں کہ نبوت انسان کی مرضی یا خواہش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ آدمی
روح القدس کی تحریک کے سبب خدا کی طرف سے بولتے تھے۔" پولوس بھی
۱ قرنتی ۱۴ : ۳۷ میں کہتا ہے۔" اگر کوئی اپنے آپ کو نبی یا روحانی سمجھے تو یہ
جان لے کہ جو باتیں میں تمہیں لکھتا ہوں وہ خداوند کے حکم ہیں۔" اور جب وہ
اسی خط کے ایک اور حصّہ میں (۷ : ۴۰) میں یوں تحریر کرتا ہے" میں جانتا
ہوں (δοκῶ) کہ خدا کی روح مجھ میں بھی ہے۔" تو اس سے ایک قسم کی
خاکساری ٹپکتی ہے جو اُس کے کلام کی سچائی کا ایک اور ثبوت ہے۔ اب اگر
اور اشخاص جن کی کتابیں بائبل میں پائی جاتی ہیں اس قسم کا دعوےٰ نہیں کرتے
تو اس سے ہرگز ہرگز یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ الہام سے بے بہرہ تھے ✤

جب ہم اس سادہ سے دعوےٰ سے کہ نوشتے الہامی ہیں گزر کر اس سوال
پر آتے ہیں کہ الہام کیا ہے ؟ تو ہمیں لوگوں کی مختلف اور متضاد آرا ہر طرف سے
گھیر لیتی ہیں۔ ادنےٰ سے لیکر اعلےٰ خیال تک جتنے تصوّرات اس اہم سوال
کے متعلّق پائے جاتے ہیں اُن میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی معاون اور حامی
موجود ہے۔ چنانچہ اس خیال سے لیکر کہ نوشتوں کے مصنّف اُسی طرح کا الہام
رکھتے تھے جس طرح کا مِلٹن یا ہِنیں یا بیتھوون رکھتا تھا اُس خیال تک جو
یہ مانتا ہے کہ بائبل کا ہر ایک لفظ ایسے طور پر خدا کا کلام ہے کہ اُس میں انسانی
عنصر کو کچھ بھی دخل نہیں۔ لوگ طرح طرح کے خیالات کے پابند چلے آئے ہیں ✤

لوگوں نے الہام کے بارے میں جو قیاسی تصورات قائم کر رکھے تھے اور
اُن تصوّرات کے قیاسی نتائج کا جو غلبہ پیدا ہو گیا تھا اُس سے بائبل کو اور ایمانداروں

کے اعتقاد کو بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔ مثلاً لوگوں نے بارہا اپنے قیاسی استدلال سے رائے زنی کرتے وقت کہا ہے۔ اگر خدا اپنی مرضی لوگوں پر ظاہر کرتا یا کرنا چاہتا تو ضرور تھا کہ وہ اپنے مکاشفے کو اس طرح یا اُس طرح جلوۂ شہود سے آراستہ کرتا۔ کہ اُس کا کلام ہرگز ہرگز مشکل اور دقیق نہ ہوتا بلکہ آسان اور صاف ہوتا۔ اور کہ اُس میں کسی طرح کی انسانی غلطی دخل نہ پاتی۔ اسی قسم کے قیاسات پر بعض کا یہ خیال مبنی ہے کہ عبرانی کے اعراب بھی الہامی ہیں کیونکہ اگر وہ الہامی نہ ہوتے تو قرأت صحیح نہ ہوتی۔ لیکن خدا کسی طرح کی غلطی یا الہام کو اپنے کلام میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا تھا کہ خدا اپنے کلام میں قواعد کی غلطیوں کو کب گھسنے دے سکتا تھا۔ نہ وہ زبان کی بھدی ترکیبوں اور نہ عبارت کے سقموں کو اپنے کلام میں داخل ہونے کی رخصت دے سکتا تھا۔ آیات کے نقادانہ ملاحظہ اور موازنہ کو لوگ مخالفت کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ وہ خیال کرتے تھے کہ جس طرح دُنیوی کتابوں کی نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اس طرح کی نکتہ چینی کے سپرد خدا اپنی کتاب کو ہرگز نہیں کر سکتا۔ اب یہ تمام خیالات جو لوگوں نے اپنے لئے قائم کر لئے تھے غلط ثابت ہو گئے ہیں۔ اور ان سے بشپ بٹلر صاحب کے مرقومہ ذیل تنبیہی کلام کی بڑی تائید ہوتی ہے۔ بشپ موصوف فرماتے ہیں "ہم اس بات کا فیصلہ شروع ہی میں نہیں کر سکتے کہ خدا کن طریقوں سے اور کس کثرت سے اپنی فوق العادت روشنی اور ہدایت ہمیں عطا فرمائیگا پس نوشتوں کے مرتبہ اور اختیار کے متعلق جو سوال غور طلب ہے وہ صرف یہ ہے کہ آیا وہ جو کچھ ہونے کا دعوے کرتے ہیں وہ ہیں بھی یا نہیں۔ پس ہمارا یہ کام نہیں کہ ہم کہیں کہ پاک نوشتوں کو ایسی یا ویسی کتاب ہونا چاہیئے۔ اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ضعیف العقل انسان چاہتا ہے کہ اُس کی اشاعت کی جائے ویسی ہی اُسکی اشاعت ہو۔ پس اب اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ دقیق مضامین۔ اور نہ عبارت کی ظاہرا نادرستی۔ اور نہ مختلف قرأتوں کا وجود۔ نہ مصنفوں کے متعلق پرانی بحثیں اور نہ اس قسم کی اور باتیں خواہ اُن کا شمار موجودہ شمار سے کہیں زیادہ

کیوں نہ ہو نوشتوں کے رتبہ اور اختیار کو زک پہنچاتیں۔ البتہ ان باتوں سے اُس وقت نوشتوں کے زور کو صدمہ پہنچتا جبکہ نبی اور رسول اور ہمارا خداوند کہہ گئے ہوتے کہ الہامی کتاب میں یہ باتیں نہ ہونگی اور پھر موجودہ نوشتوں میں یہ باتیں پائی جاتیں" +

پس اس سے روشن ہے کہ ہم فقط بائیبل ہی سے یہ بات دریافت کر سکتے ہیں کہ الہامی کتاب کسے کہتے ہیں۔ اب اگر ہم اس خیال کو اپنے دل میں رکھیں اور پھر بائیبل کا مطالعہ شروع کریں تو بائیبل کی مشکلات سے ہمیں کسی طرح کا صدمہ نہیں پہنچیگا۔ بشرطیکہ ہم اُس کے مطالعہ سے پیشتر اپنے پہلے خیالات کو دل سے نکال دیں۔ یعنی یہ نہ کہیں کہ الہام کا مطلب میری دانست میں یہ ہے یا وہ ہے کہ اُسے یہ کرنا چاہیئے یا وہ کرنا چاہیئے۔ ہم اس بات کی تلاش نہ کریں کہ ہمیں بائیبل میں الہام کا وہ تصوّر دکھائی دے جو ہمارے دل پر نقش ہو رہا ہے۔ بلکہ ہم اس بات کے لئے تیار ہوں کہ جو تصوّر الہام کے متعلق بائیبل میں پایا جاتا ہے اُسے دل وجان سے قبول کریں۔ مثلاً اگر بائیبل کے ملاحظہ سے یہ بات روشن ہوجائے کہ بائیبل کی تصنیف میں انسانی لیاقت اور طاقت کو بہت سا دخل ہے تو لازم ہے کہ ہم الہام کے مُتعلق اپنے خیال کو ایسا وسیع کریں کہ انسانی طاقت کا عنصر اس میں بآسانی سما جائے۔ اور اسی طرح اگر ایسی مشکلات نظر آئیں جن کی تطبیق بظاہر ناممکن معلوم ہو تو وہ بھی الہام کی تعریف وضع کرنے میں ہماری مدد کریں +

پروفیسر ہوٹن صاحب نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جسکا نام "کرسچن ریولیشن" ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں "الہام کا وجود کتاب میں جلوہ نما ہے مگر الہام کے مطلب یا مقدار کا فیصلہ فقط قیاسی استدلال سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ فیصلہ نتیجہ سے ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ الہام کیا ہے تو ہم یہ دیکھیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ ہمیں کتابوں کی خاصیت کا فیصلہ الہام کے تصوّر سے نہیں کرنا چاہیئے بلکہ الہام کی خاصیت کا فیصلہ کتابوں کے وسیلے کرنا چاہیئے" +

الہام کے متعلق سب سے اہم اور حل طلب سوال یہ ہے کہ الٰہی کلام میں الٰہی اور انسانی مداخلت کا باہمی تعلق کیا اور کیسا ہے۔ کہاں تک اُس میں الٰہی طاقت کا دخل ہوتا ہے اور کہاں تک انسانی طاقت کا۔ اس معاملے میں طرح طرح کے خیالات مروّج ہیں۔ مگر سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بعض کے مطابق کلام الٰہی میں انسان کی طاقت کا دخل زیادہ ہوتا ہے اور بعض کے مطابق کم۔ پس اُن مختلف درجوں کے مطابق جو اس خصوص میں الٰہی اثر یا طاقت سے منسوب کئے جاتے ہیں ذیل کے خیالات مروج ہیں ؞

۱۔ وہ خیال جو انگریزی زبان میں مکینیکل (Mechanical) یا ڈکٹیشن (Dictation) تھیوری کے نام سے موسوم ہے اس میں انسان محض کاٹھ کے پُتلے کی طرح بے حس و حرکت ہوتا ہے۔ خدا لکھواتا جاتا ہے اور وہ لکھا جاتا ہے اس خیال میں الٰہی عنصر درجہ غایت پر نظر آتا ہے اور انسانی طاقت برائے نام دکھائی دیتی ہے۔ انسانی خواص اور قواء دب جاتے ہیں اور خدا جو انسان کے اندر داخل ہوتا ہے اُس کے اعضا کو گویا بغیر اُس کی رضا کے اپنے کام میں لاتا ہے۔ آدمی خدا کی آواز بن جاتا ہے اور اپنی زبان سے وہ کلمات نکالتا ہے جن کے مفہوم سے واقف ہونا یا نہ ہونا اُس کے لئے ضروری امر نہیں۔ پس وہ ایسے خیالات لوگوں کے سپرد کرتا ہے جنہیں اُس کی عقلی طاقتوں نے خود گرفت نہیں کیا ہے۔ وہ ایک ایسے دماغ اور ایک ایسی مرضی کا محکوم ہوجاتا ہے جو اُسکی اپنی نہیں ہوتی ؞

اس خیال کی قدر غیرمسیحی اقوام میں بہت کی جاتی تھی۔ مگر مسیحیوں میں بہت کم۔ غیر اقوام کے درمیان حقیقی الہام کا نشان ہی یہی مانا جاتا تھا کہ انسان ازخود رفتہ ہوجائے۔ وہ لوگ پولوس کے اُصول کو جو یہ تلقین کرتا ہے کہ نبی کی رُوح نبی کے تابع ہونی چاہیئے قابل وقعت نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اُن کے نزدیک یہ اصول زیادہ معقول تھا کہ آدمی جس قدر زیادہ الہام پانے کی حالت میں ہوتا ہے اُسی قدر کم اپنے اوپر قابو رکھتا ہے۔ پس اس وارفتگی کی حالت کو پیدا کرنے کے

لئے وہ لوگ کبھی طرح طرح کی ادویات کو سونگھتے اور استعمال کرتے تھے اور کبھی بے تحاشا رقص و سرود کے وسیلے اس حالت کو پیدا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے - افریقہ اور دیگر مشرقی ممالک میں یہ حرکات ابتک دیکھی جاتی ہیں - اسی طرح یہ بھی مانا جاتا تھا اور مانا جاتا ہے کہ لوگ غش کی حالت میں وہ کچھ دیکھتے ہیں جو عقلی اور دماغی قواء کے برجا رہنے کی حالت میں نظر نہیں آتا - اسی لئے خواب وغیرہ خدا کی مرضی کے اعلان یا اظہار سمجھے جاتے ہیں - اب اس عقیدے کی نسبت یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ یہ محض عام بُت پرستوں کی زود اعتقادی کا نتیجہ تھا - نہیں اُن کے بڑے بڑے عالم بھی اس بات کو مانتے تھے مثلاً افلاطون ٹیمیس (Timaeus) میں کہتا ہے "خدا نے پوشیدہ رمزوں کے جاننے کی طاقت حکمت کو نہیں بخشی - بلکہ یہ طاقت انسان کی بیوقوفی کو عنایت کی ہے - مثلاً کوئی شخص اس وقت جبکہ اُس کی عقل برجا ہوتی ہے نبوی سچائیوں اور الہامی صداقتوں کو نہیں جان سکتا - کیونکہ جب کبھی اُسے الہامی کلام بخشا جاتا ہے اُس وقت اُس کی عقل کو یا تو عالم خواب اُڑائے جاتا ہے یا کسی اور طرح کی دماغی خرابی دبا لیتی ہے" پھر فیڈرس میں وہ دیوانہ پن کی چار صورتیں بیان کرتا ہے جو یہ ہیں - نبوّت - الہام - شاعری اور عشق - اور پھر کہتا ہے کہ وہ شخص جو خود پر قابو رکھتا ہے ان کا مظہر یا مورد نہیں ہو سکتا ہے ٭

اُس انسانی حالت کو جو الہامی باتوں کے قبول کرنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی ادا کرنے کے لئے ایک خاص یونانی لفظ استعمال کیا جاتا تھا - وہ لفظ ἔκφρων (ازخود رفتہ) تھا - مثلاً افلاطون کے "آیون" (Ion) میں یہ الفاظ آتے ہیں ἔνθεός τε καὶ ἔκφρων اور پھر پلوٹارک کے تھیمس ٹاکلیز (C.XXVI. 2) میں ایک تالیق کا ذکر ہے جس کا نام اولبیاس تھا - وہ ایک دم الہام پانے والی حالت میں آگیا - اُس کی حالت ان لفظوں میں ادا کی گئی ہے ἔκφρων γενόμενος καὶ θεοφόρητος

پھر ورجل چھٹی اینیڈ میں ایک عورت کا ذکر کرتا ہے جو کہانت کا کام کیا کرتی تھی وہ کوشش کر رہی تھی کہ دیوتا کو اپنے پاس نہ آنے دے۔ چنانچہ اُس کی تاثیر سے بچنے کے لئے اُس نے بہت جدّ و جہد کی۔ مگر آخر کار اُسکے قابو میں آ ہی گئی ٭

اب اس سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ اس بات کو مانتے تھے کہ انسانی طاقتیں جس قدر کم کام کرتی ہیں اُسی قدر خدا کا الہام زیادہ کامل ہوتا ہے۔ گویا ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک انسان کی عقل اور سمجھ اپنا کام کرتی رہتی ہیں تب تک خدا کو اپنی مرضی کے ظاہر کرنے کا پُورا پُورا موقع نہیں ملتا۔ لیکن جب یہ طاقتیں کچھ عرصہ کے لئے بند ہو جاتی ہیں تو خدا اپنی مرضی کو اچھی طرح ظاہر کرتا ہے۔ اسی لئے اُس تعلق کو واضح کرنے کے لئے جو الہام بخشنے والے خدا اور الہام پانے والے انسان میں پایا جاتا ہے۔ وہ لوگ دو مثالیں دیا کرتے تھے۔ پہلی مثال بربط اور بربط نواز کی تھی اور دوسری لکھنے والے اور اُس کے قلم کی تھی۔ یعنی وہ کہا کرتے تھے کہ جو رشتہ بربط نواز اور بربط میں پایا جاتا ہے یا جو رشتہ محرر اور اُس کے قلم میں پایا جاتا ہے اُسی طرح کا رشتہ الہام دینے والے خدا اور الہام پانے والے انسان میں موجود ہے۔ پس اُن کے نزدیک انسان محض ایک کل کی مانند تھا۔ اور جو کام اُسکے وسیلے سے کیا جاتا تھا اُس میں اُس کی عقل اُس کے جذبات اور اُس کی مرضی کو کچھ بھی دخل نہ تھا۔ جو کچھ اُس سے لکھوایا یا کہلوایا جاتا تھا وہ پُورے پُورے طور پر خدا سے منسوب کیا جاتا تھا۔ یا یوں کہیں کہ اُس کا ایک لفظ خدا کا کلمہ تصور کیا جاتا تھا ٭

یہ خیال اگر ان دنوں مانا جا سکتا ہے تو بہت ہی بدلی ہوئی صورت میں مانا جا سکتا ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ یہ خیال بہت ہی مروّج تھا اور واقعی قدامت جس قدر قدر و منزلت کسی بات کو دے سکتی ہے وہ اسکو حاصل ہے۔ کیونکہ بعض قدیم مسیحی آبا بھی بربط اور گز کی مثال استعمال کیا کرتے تھے اور ایسے طور پر کہ اُن کے الفاظ کو پڑھکر یہ شبہ گزرتا تھا کہ شاید وہ بھی اس مکینکل خیال کو مانتے تھے۔ چنانچہ انتھاگورس نبیوں کا ذکر کرتے ہوئے

کہتا ہے کہ "جب وہ وجد کی حالت میں ہوتے تھے اور اُن کی عقل کی طاقتیں کافور ہو جاتی تھیں اُس وقت وہ وہی باتیں کہا کرتے تھے جو اُن سے کہلوائی جاتی تھیں رُوح اُنہیں آلہ کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ ہاں اُسی طرح جس طرح کہ بنسری بجانیوالا بنسری کا استعمال کرتا ہے۔" فیلو بھی جو بڑا عالم اور فاضل آدمی تھا باوجود اپنے علم و فضل کے یہ مانتا تھا کہ الہام ایک قسم کا وجد ہے اور ملہم اشخاص بمنزلہ آواز کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ جن باتوں کو وہ اپنے مُنہ سے نکالتے ہیں اُن پر اُنہوں نے اپنی سوچ اور فکر کو صرف نہیں کیا ہوتا۔ وہ فقط خدا کے کلام کو اپنے لبوں سے ادا کر دیا کرتے ہیں ۔

یہی وجہ تھی کہ یہودی لوگ نوشتوں کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کو متبرک سمجھتے تھے۔ اُن کے درمیان یہ روایت متداول تھی کہ جب موسیٰ پہاڑ پر گیا اُس وقت اُس نے دیکھا کہ خداوند خدا آپ توریت کی کتاب خوبصورت حروف میں لکھ رہا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے ہر ایک کتاب کے الفاظ اور حروف گن ڈالے۔ اور مقدس کتاب کی بالکل خارجی اور عارضی باتوں میں بھی بڑے بڑے پُر راز مطالب بھر دئے ۔

دوسری صدی میں مانٹینزم نے اس عقیدے کو اور بھی مضبوط کر دیا جسکی مخالفت ملٹیاڈیز نے بڑی صفائی اور صراحت سے کی۔ لیکن اس عقیدے نے جو گرفت مسیحیوں کے خیالات پر حاصل کر لی تھی اُس کا زور ہم پر اُس وقت اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ریفارمیشن کے بعد بھی یہ عقیدہ مروّج رہا ۔

اب جس خیال یا عقیدے کا منطقی نتیجہ یہ ہو جو ہم بیان کر آئے ہیں وہ نوشتوں کی تعلیم کے مطابق صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا وہ ماننے کے قابل نہیں ہے۔ نوشتوں کا مطالعہ ایک دگرگوں صورت ہمارے سامنے لاتا ہے۔ مثلاً جو تیاری لوقا نے اپنی انجیل کے لکھنے کے لئے کی جس کا ذکر وہ اپنی انجیل کے شروع میں کرتا ہے۔ اُس سے صاف ظاہر ہے کہ لوقا کسی دوسرے شخص کے خیالات کو ادا کرنے کا ایک آلہ نہ تھا۔ اسی طرح اگر وہ تاثبانہ نوحے اور خوشی سے بھری ہوئی

شکر گزاریاں اور حمد و سپاس سے معمور غزلیں جو ہم مزامیر میں پاتے ہیں فی الحقیقت انسانی غم اور انسانی سوچ اور تجربہ کا پھل نہیں ہیں تو وہ بالکل بے مغز ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گندم نمائی اور جو فروشی کی مثال ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی یا یہ کہیں کہ نبیوں کو کل کے طور پر کام میں لاتا اُس سارے تجربے اور علم کے برخلاف ہے جو ہم خدا کے کاموں کے مُتعلق رکھتے ہیں*

اور اس فرضی طریقہ کا فرضی نتیجہ بھی اُسی طرح خدا کے معمولی طریقوں سے بعید ہے جس طرح کہ الہام دینے کا فرضی طریقہ بعید ہے۔ اب وہ فرضی نتیجہ کیا ہے وہ وہ کتاب ہے جو بائبل کہلاتی ہے اور جس کا ہر ایک لفظ گویا ایسا ہی خدا کے مُنہ میں کا نکلا ہوا کلمہ سمجھا جاتا ہے جیسا کہ اُس وقت سمجھا جاتا جبکہ خدا بغیر انسانی وساطت کے براہ راست ہم سے کلام کرتا*

بموجب اس خیال کے کسی طرح کی سہو کے لئے جگہ نہیں رہتی۔ لہذا ہر ایک تواریخی اور سائنٹفک اور کرونولاجیکل (شمار اوقات) کے بیان کا ایک ایک لفظ اور شوشہ صحیح ہے۔ ضرورت نہیں کہ ہم اس خیال کی تمام مشکلات اور باہمی اختلافوں کا ذکر کریں۔ یہی کہنا کافی ہے کہ یہ خیال ایسی مشکلات پیش کرتا ہے جن کا رفع کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ ہم سے طلب کرتا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ بائبل ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی طرح کی سہو کبھی نہیں آسکتی اور جس کی ہر ایک کتاب ایسے ہی الہام سے پُر ہے۔ یہ خیال ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم تمام اختلافات کا حل پیش کریں۔ اور ہم کہتے ہیں کہ اگر اس قسم کی بائبل ہمارے لئے ضروری ہوتی تو اُس کے پیدا کرنے کا انتظام خدا ضرور کرتا۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ ہمارے پاس اس وقت ایک ایسی بائبل موجود ہے جو ہر ایک امر میں اُس سے جو شروع میں لکھا گیا تھا پوری مطابقت نہیں رکھتی۔ نسخوں میں کچھ نہ کچھ سہو کتابت سے ابتری پیدا ہوگئی ہے۔ ترجمے پُورے پُورے طور پر مطلب کو ادا نہیں کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس سوائے ان کے اور کچھ نہیں ہے پس یہ مکینکل یا مبرّا عن الخطا ہونے والا مسئلہ درحقیقت ہمیں کوئی مبرا عن الخطا

بائیبل نہیں دیتا بلکہ برعکس اس کے اس قسم کی بائیبل کو ہمارے ہاتھ سے چھین لیتا ہے۔اگر ہر طرح کی غلطی سے آزاد اور بری ہونے کا دعوے کیا جاسکتا ہے تو صرف اُن نسخوں کی نسبت کیا جاسکتا ہے جو ملہم رسولوں اور نبیوں کے قلم سے شروع میں نکلے تھے۔مگر وہ اس وقت ہمارے ہاتھ میں نہیں ہیں۔پس اتنا کہنے میں کوئی عیب نظر نہیں آتا کہ اگر ہماری نجات کے لئے بائیبل میں لفظی صحت کی ضرورت ہوتی تو خدا اُس میں سرمو فرق نہ آنے دیتا۔اگر یہ لازمی امر ہوتا کہ ہم خاص اُنہیں لفظوں سے واقف ہوں جو ابتدا میں ہر نبی اور رسول کے قلم سے نکلے تو ہم اس وقت خدا کے کلام کے فوایدسے سراسر محروم رہتے۔کیونکہ سپچوریجنٹ اور عبرانی عہد عتیق کے درمیان کئی قسم کا لفظی اور ترتیبی تفاوت نظر سے گزرتا ہے۔اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کونسا متن اصل کے زیادہ قرین ہے ؎

نوشتوں کے متعلق دو باتیں ہیں جو وربل انسپائریشن (Verbal inspiration لفظی الہام) کے برخلاف ہیں ؎

(الف) اوّل وہ طریقہ ہے جسکے مطابق پرانے عہدنامہ سے نئے عہدنامہ میں اقتباسات درج کئے گئے ہیں۔ایسے اقتباسات شمار میں ۲۷۵ ہیں ؎

ان میں سے صرف ۵۳۔ایسے ہیں جن میں عبرانی اور سپچوریجنٹ (یونانی) اور نیا عہدنامہ لفظ بلفظ متفق ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مقامات میں سپچوریجنٹ نے عبرانی کا یونانی ترجمہ لفظی رعایت کو مدنظر رکھکر کیا ہے۔اور اُسکو نئے عہدنامہ کے مصنفوں نے اُسی طرح اقتباس کیا ہے ؎

پھر ۱۰۔ایسے اقتباس ہیں جن میں گویا مصنفوں نے سپچوریجنٹ کی یونانی کی تصحیح کرکے اُسے عبرانی کے مطابق کردیا ہے ؎

۳۷۔ایسے ہیں جن میں سپچوریجنٹ کے ترجمہ کو قبول کرلیا ہے گو اُس میں اور اصل عبرانی میں کچھ نہ کچھ تفاوت موجود ہے ؎

(۲) ہمارے خداوند کے اقوال اناجیل میں ہمیشہ ایک ہی الفاظ میں بیان نہیں ہوئے ۔ چنانچہ خود خداوند کی دُعا کے جملے متی اور لوقا کی اناجیل میں کسی قدر متفرق ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اگر لفظی الہام کو مانیں تو اس اختلاف کی وجہ کیا ہوگی اُس کی تو کوئی گنجائش نہ رہیگی +

البتہ ۱ قرنتی ۲ باب میں پولوس یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ میرے الفاظ بھی روح القدس کے سکھائے ہوئے الفاظ ہیں ”ہم ان چیزوں کو اُن الفاظ میں نہیں بیان کرتے جو انسانی حکمت نے ہم کو سکھائے ہوں بلکہ اُن الفاظ میں جو روح نے سکھائے ہیں“ لیکن غور سے پڑھنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ پولوس یہاں تعلیم کے دو طریقوں کا مقابلہ کرتا ہے جن میں سے ایک دُنیاوی اور ایک روحانی ہے اور کہ میرا طریقہ روح کا سکھایا ہوا طریقہ ہے ۔ جس خاص طرز اور عبارت میں اُس نے اپنے پیغام کو پیش کیا اُس کی وہ حمایت کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ دُنیا ایک خاص طرح سے علم سکھاتی ہے اور روح خدا ایک دوسرا طریقہ استعمال کرتی ہے +

لفظی الہام کا خیال اس پر مبنی ہے کہ خدا ملہم شخص کے دل میں ایک خاص تعلیم ڈال دیتا ہے جس کا اس کے عقلی اور جسمانی قوے و لوازمات سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا ۔ اس لئے جن الفاظ میں وہ تعلیم ظاہر کی جاتی ہے ان کو بھی منجانب اللہ ماننا پڑتا ہے ۔ لیکن بائیبل ایسے خیال کی تصدیق نہیں کرتی ۔ اصل بات یہ ہے کہ جس شخص کو الہام ملتا ہے وہ محض جادو منتر کے طور پر نہیں بلکہ اُس شخص کے سارے عقلی اور روحانی قوائے الہام سے موثر ہوکر روح القدس کے اوزار بن جاتے ہیں تاکہ اُسکے مقصد کو پورا کریں +

۲ ۔ بعض عالم یہ سمجھتے ہیں کہ الٰہی تاثیر سے انسانی قوائے معطل و بیکار نہیں ہوجاتے بلکہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں ۔ یہودی ربیوں کے ذریعے یہ رائے کلیسیا میں آئی ۔ ان کا خیال یہ تھا کہ الہام کے مختلف درجے ہیں شریعت کا الہام سب سے اعلےٰ اور افضل ہے ۔ انبیا کا کچھ اس سے

کم درجہ ہو۔ اور کتو بیم کا اُن سے کم درجہ ہو۔ چنانچہ متکلمین نے الہام کے چار درجے بتلائے ہیں (۱) نگراں ( ) جو غلطی سے بچاتا ہے (۲) تعلی ( ) جو خیالات کو اعلیٰ بناتا ہے (۳) ہادی ( ) جو ملہم شخص کو بتاتا ہے کہ کیا لکھے اور کیا چھوڑے۔ (۴) مدرک ( ) جو خیالات اور الفاظ دونوں کو مؤثر کرتا ہے۔ بعض صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ ان درجوں وغیرہ کے جھمیلے میں پھنسنے سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم اتنا مانیں کہ خدا نے خیالات بذریعہ الہام دئے ہیں نہ کہ الفاظ۔ پلوٹارک (Plutarch) نے اس مسئلہ پر خوب بحث کی ہے کہ اگر یہ الہامات دیوتاؤں کی طرف سے ہیں تو کیوں یہ صریح عبارت میں نہیں دئے جاتے بلکہ اکثر اوقات دو معنی ہوتے ہیں جن سے مختلف معنی نکل سکتے ہیں۔ اُس کا دوہرا جواب ہے (۱) اگر پائی تھیا (agar-pathea) جس کے وسیلے الہام ملتا ہے۔ غار میں جاتے وقت ارغوانی لباس نہ پہنے اور عطریات سے اپنے تئیں معطر نہ بنائیں تو پھر بھی وہ دیوتا کا اوزار یا الہام دینے کا وسیلہ ہے لباس فاخرہ کی کمی اُسکے اوزار اور وسیلہ بننے میں کمی واقع نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ بے جذبہ اور پاک دیوتا ان ظاہری باتوں کا لحاظ نہیں کرتا۔ (۲) دیوتا الہام دیتا ہے لیکن جن الفاظ میں ہیں وہ الہام دیا جاتا ہے وہ ملہم نبیہ کے ہیں مثلاً اگر اُس کو حکم ملتا ہے کہ اُس الہام کو بذریعہ زبان ظاہر کرنے کے احاطۂ تحریر میں لائے تو وہ تحریر وہ دستخط تو دیوتا کا نہیں ہوگا اور کیا ہم یہ اعتراض کرینگے کہ چونکہ اس کا خط شاہی فرمانوں سے کہیں ادنےٰ ہے اس لئے یہ الہام دیوتا کی طرف سے نہیں؟ اس طرح نبیہ کی آواز۔ طرز تحریر اور وزن جس میں وہ الہام منکشف ہوا دیوتا کے نہیں بلکہ دیوتا نے تو رویت عطا کی اور نبیہ کی سوح کو منور کیا اور آیندہ کو اُس پر ظاہر کیا۔ یہ الہام ہے"۔

اس رائے کو ڈینامک (dua mic) کہتے ہیں اور اس میں

وہ ساری رائیں داخل ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ جو تعلیمات کتاب مقدس میں آئی ہیں وہ تو منجانب اللہ ہیں لیکن جو نقص اور کمزوریاں ہیں وہ انسانی ہیں۔ اگسٹین نے اس رائے کو ان الفاظ میں ظاہر کیا کہ "مصنف تو ملہم ہے لیکن عبارت انسانی ہے"۔

ایک رومن کیتھالک مصنف کی تحریر سے اسکی زیادہ تشریح ہوسکتی ہے:-
"الہام کے بارہ میں موحدانہ درست خیال یہ ہے کہ ہمہ دان اور قادر مطلق خدا نے ایسے وسائل چُنے اور ان کو تحریک دی کہ جن کے افعال عین اُس کی مرضی کے مطابق تھے۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ بربط کا کام بانسلی سے اور بانسلی کا نرسنگوں سے لے۔ ان کے انسانی قوے کو اس نے محفوظ رکھا۔ اس لئے جو کچھ وہ کہتے تھے اُسے جانتے تھے اگرچہ اُس کا پُورا مطلب ان کی رسائی سے پرے ہو۔ پوپ لیو سیزدہم نے یہ حکم جاری کیا کہ "جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ مقدس نوشتوں کے کسی مقام میں غلطی کا امکان ہے وہ الہام کے کیتھالک معنوں کو بگاڑتے ہیں اور خدا کو اُس غلطی کا بانی ٹھیراتے ہیں"۔ الغرض یہ رائے بھی کتاب مقدس پر عاید نہیں ہوسکتی +

مذکورہ بالا رائے کو بعضوں نے دوسرے الفاظ میں یوں ظاہر کیا ہے کہ خدا نے الہام ایک خاص غرض و مقصد کے لئے دیا اس لئے جو کچھ اُس مقصد و غرض کے لئے ضرور تھا اُس کی اُس نے حفاظت کی اور جو غیر ضرور تھا اُس میں ان کو آزاد رہنے دیا۔ ابراسمس۔ گروٹیوس۔ بیکسٹر پیلی اور بعض دیگر جرمن علما کی یہی رائے تھی +

لیکن اس رائے سے بھی ہمیں پوری تشفی حاصل نہیں ہوتی۔ اور اسکی تشریح نہیں کرتی کہ کیسے یہ ہوسکتا ہے کہ ملہم ایک فقرہ کے لکھتے وقت تو فوق العادت علم سے مزین ہوں اور دوسرا فقرہ لکھتے وقت وہ اُس سے بالکل معرا ہوں۔ کہ تعلیمی مسائل میں تو وہ لاغلط ہو لیکن تاریخی معاملات پیش کرنے میں وہ بھٹک جائے۔ اور اس سے اُس رشتہ کی تشریح ہوتی

ہے جو الہٰی اور انسانی روح میں پیدا ہوتا ہے جس سے یہ نتائج نکلتے ہیں۔
الغرض یہ رائے امور واقعی کو تو پیش کرتی ہے لیکن انکی تشریح کچھ نہیں کرتی۔
اس کا فتوےٰ یہ ہے کہ ضروری امور میں تو کتاب مقدس لاغلط ہے لیکن غیر ضروری امور میں وہ محض انسانی ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہم کتاب مقدس میں اس امر کو کس طرح دریافت کریں کہ یہ ضروری ہے اور یہ غیر ضروری ہے۔
اس لئے کوئی سالم رائے تو نہ ٹھیری جس سے الہام کی تعریف کر سکیں۔
لیکن ایک یا دو باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جو الہام کی تعریف میں خواہ کسی طرح سے کی جاے ضرور ہونی چاہئیں ؛

(۱) اول الہام کے بارہ میں یہ یاد رکھئے کہ الہٰی روح کی حضوری اور تاثیر اُس میں ہے۔ اگرچہ کوئی شخص اور کوئی شے اور مقام الہٰی روح کی تاثیر اور حضوری سے خالی نہیں لیکن ملہم شخص میں وہ روح خاص طور سے اپنی تاثیر اور حضوری کو ظاہر کرتا ہے ؛

(۲) الہام کا خاص تعلق انسانی سیرت سے ہے۔ جس روح حق کا وعدہ شاگردوں سے ہوا تھا وہ قدسیت کی روح تھی۔ جو خدا کے مقاصد کے ساتھ سب سے زیادہ ہمدرد اور قدسیت کی روح سے معمور تھے انہیں کو مکاشفات دیکھنے اور بیان کرنے کی نعمت ملی۔ ایسے شخص روح کے خالص اوزار اور وسائل بن گئے۔ اس لئے جو کچھ وہ دیکھتے تھے وہ مستند طور سے بیان کرتے تھے یہ جانکر کہ ہم اپنی مرضی نہیں بلکہ خدا کی مرضی بیان کر رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ملہم شخص تاریخی واقعات غیر ملہم شخص سے بہتر نہ جانتا ہو لیکن وہ خدا کو تاریخ میں دیکھتا حالانکہ غیر ملہم شخص کو وہاں محض انسانی جذبات ہی نظر آتے ہیں ؛

الہام دراصل ایک روحانی انعام ہے اور بعد ازاں ایک عقلی انعام۔ ملہم شخص کے عقلی قوے پر جو اثر ہوتا ہے وہ اگرچہ براہ راست نہیں تو بھی وہ کچھ کم نہیں پر جوشی کی طرح یہ عقل کو روشن کرتا اور اُسے اعلےٰ بناتا ہے

اور محبت کی طرح یہ قوت حافظہ کو وسیع کر دیتا ہے۔ اور خلوص قلبی کی طرح یہ
خرد و فہم کو منور کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ ایک پولوس جیسے ذی عقل اور
لائق فائق شخص کو اپنے ہاتھ میں لاتا ہے۔ لیکن بائبل سے اتنا تو ظاہر ہے
کہ الہام کے ذریعے کسی کو جسے پہلے حاصل نہ تھی فہم کی تیزی تو عطا نہیں ہوئی
اور جہاں معمولی تحقیقات سے کچھ امر دریافت ہو سکتا تھا وہاں فوق العادت
علم تو دیا نہیں گیا۔ مثلاً لوقا کو اپنی انجیل کے مضامین لکھنے کے لئے بڑی
چھان بین سے کام لینا پڑا۔ محض فوق العادت علم سے وہ سارے ماجرے
اُس نے انجیل میں قلمبند نہیں کئے۔ اور چونکہ اُس کا بیان بعض امور میں
مرقس کے بیان سے متفرق ہے اس لئے الہام کا مقصد محض لفظی مطابقت
کا نہ ہوگا۔ بلکہ کچھ اور۔ یہی حال خلقت کی پیدائش کے بیان میں پایا
جاتا ہے۔ وہاں الہام کا منشا یہ نہ تھا کہ سائنس کی باریکیاں اُس میں پائی
جائیں بلکہ یہ کہ خلقت میں خالق کا پتا دے۔ اس لئے سارے پُرانے عہد نامہ
میں لفظ پر زور نہیں بلکہ روح پر۔ چنانچہ جن تاریخی واقعات کا بائبل میں ذکر
ہے اُن سے بجائے نفع کے بہت نقصان پہنچتا۔ اگر وہ کسی مختلف طرح
سے لکھے جاتے جو بدی میں خوشی۔ نفس پرستی میں شاد اور شیطان سے
دل بستہ ہے لیکن چونکہ وہ ملہم اشخاص کے تحریر کردہ ہیں اس لئے ہر جگہ
خدا کو پیش کیا ہے اور بدی کو خطرناک بتایا ہے۔

(۳) مختلف کتابوں کے پڑھنے سے ظاہر ہے کہ اگرچہ ایک ہی
مقصد اور روح سے وہ لکھی گئیں لیکن ان کا طرز تحریر یکساں نہیں۔ یسعیاہ
یا پولوس کا الہام امثال کی کتاب کے مؤلف یا تواریخ کی کتابوں کے مصنف
سے متفرق ہے۔ اسی طرح مفید ہونے کے لحاظ سے بھی وہ مختلف ہیں
جس قدر فائدہ ہم زبور کی کتاب یوحنا کی انجیل اور خطوں سے نکال سکتے
ہیں اُس قدر احبار کی کتاب وغیرہ سے نہیں نکال سکتے۔ یہی حال ہمارے
بدن کا ہے۔ بعض اعضا ایسے ہیں جن کے بغیر بدن کی زندگی قائم رہ

نہیں سکتی اور بعض اعضا ایسے ضرور نہیں ⁂

(۴) اب ہم یہ ذکر کیا چاہتے ہیں کہ الہام کا مقصد کیا ہے یہ فضول انعام نہیں کہ جس کا کچھ خاص مقصد نہ ہو یا محض انسانی عقل سے بلا انعام وہ مطلب نکل سکتا ہو۔ غرض الہام کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ خدا کے مظہرات کو انسان سمجھ سکے اور انسانی عقل اور انسانی ضروریات کے تقاضنے کو پورا کر سکے بائیبل میں یہ غرض پوری ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں خدا کے مکاشفے اور اسکی مرضی کا معتبر بیان ہے۔ اس معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسکے شوشہ تک الہامی ہیں یعنی جس مقصد کے لئے وہ لکھی گئی اس مقصد میں سے ایک ذرہ بھی فوت نہیں ہوتا ⁂

لاغلط

اناجیل پر نکتہ چینی۔ اس امر میں علما نے جو تحقیقات زمانہ حال میں کی ہے اس کا مفصل بیان کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں مثلاً ایبٹ سینڈے۔ کارپنٹر۔ رائٹ وغیرہ صاحبان کی تحقیقات سے زمانہ واقف ہے۔ کہ اُنھوں نے کیا کچھ دریافت کیا اور کس طرح سے دریافت کیا۔ اور ہم سب کم و بیش اس پر اتفاق کر چکے ہیں کہ اناجیل میں سے وہ بیان سب سے پہلے لکھا گیا جو پطرس سنایا کرتا تھا اور جسے شاید کچھ تبدیلی سے مرقس نے اپنی انجیل میں قلمبند کیا۔ اور وہ رسالہ جو لوگیا کے نام سے مشہور ہے جس کو متی اور لوقا نے بہت کچھ اپنی انجیلوں میں استعمال کیا اور خود ہماری تحقیقات نے اس تحقیق جدید کی بہت کچھ تصدیق کر دی ہے کہ ان اناجیل کا باہمی رشتہ اور الگ الگ خواص کیا ہیں۔ مثلاً یہ کہ متی اور لوقا نے بہت کچھ مرقس کی انجیل کو استعمال کیا۔ اور متی نے اپنی انجیل یہودیوں کے لئے لکھی تاکہ ان کو ہمارے خداوند کی مسیحیت کا یقین دلائے۔ اور اس مقصد کے لئے وہ حسب حال واقعات

اور تقریریں چُن لیتا ہے۔ توقا مرقس کے سادہ بیان کو ذرا رنگین کردیتا ہے اور چونکہ وہ ایک ایک تعلیم یافتہ غیر قوم کو تعلیم دینا چاہتا ہے اس لئے وہ اس قسم کے مناسب واقعات کو درج کرتا ہے ٭

اس نکتہ چینی کے چند نتائج۔ اناجیل کا چشمہ۔ سیرت اور باہمی رشتے دریافت کرتے کرتے کئی ایک اور باتیں بھی دریافت ہوگئیں۔ جن کا کچھ ذکر ہم یہاں کیا چاہتے ہیں۔ البتہ جو بڑے بڑے نتائج نکلے ہیں ان کو بالفعل نظر انداز کرتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اگر اس مضمون کی تحقیق کے وقت کسی کے دل میں یہ تعصّب بیٹھا ہوا ہو کہ معجزے ناممکن ہیں۔ تو خداوند مسیح کی زندگی کی صورت بالکل بدل دی جائیگی اور انجیل نویس ناقص اور ناقابل اعتبار مصنّف سمجھے جائینگے۔ کوئی علمی یا تاریخی نکتہ چینی اناجیل کی ایسی کتر بیونت نہیں کرسکتی جیسے اس متعصب مزاج نے کی ہے۔ لیکن معجزوں کی حمایت کا یہاں موقع نہیں ہم اناجیل کے متعلق صرف اُن امور کا ذکر کرینگے جن کے باعث کلیسیا کے بعض ممبران کا ایمان معرض خطر میں ہے۔ اگرچہ وہ مسیح کی زندگی کو کسی نہ کسی طرح سے اعجازی مانتے ہیں ٭

یہ نکتہ چینی اناجیل کے لفظی طور پر لاغلط ہونے کو رد کرتی ہے۔ آجکل علما کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نہ تو پُرانے عہدنامہ کی نسبت اور نہ نئے عہدنامہ کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں کوئی لفظی غلطی واقع نہیں ہوئی ہے۔ زمین کھودنے سے جو قدیم تحریریں غیر فلسطینی قوموں کی حال ہی میں دستیاب ہوئی ہیں اُن سے یہ تو بخوبی پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ عبرانی تاریخ بحیثیت مجموعی درست اور راست ہے البتہ انہیں جدید دریافتوں سے بعض سنوں کی اور چند چھوٹی چھوٹی

تفصیلوں کی غلطیاں بھی ظاہر ہوگئی ہیں۔ اگر ہم صرف نئے عہد نامہ اور اُس میں صرف اناجیل پر نظر کریں تو معلوم ہوگا۔ کہ ہمارے خداوند کے بعض اقوال اور افعال جو یہاں چاروں اناجیل میں ہوا ہے اُس میں بعض اختلافات ایسے ہیں کہ ہم قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کونسا بیان زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ مثلاً صلیب پر جو لقب ہمارے خداوند کا لکھا گیا اسکے بارہ میں کوئی سی دو انجیلیں متفق نہیں۔ اور نہ مسیح کے جی اُٹھنے کے بعد اُس کے ظہوروں کے بارہ میں اتفاق ہے۔ مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں تو یہ ذکر ہے کہ جب خداوند کے بدن کو قبر میں رکھے دو رات اور ایک دن ہوگئے تھے تب عورتیں خوشبو اور مصالح لیکر گئیں لیکن یوحنا کی انجیل میں مذکور ہے کہ یوسف ارمتیا اور نکودیمس نے قبر میں رکھنے سے پیشتر اُس کے بدن پر خوشبو وغیرہ ملی تھیں۔ مرقس۔ لوقا اور یوحنا کے بیان میں آیا ہے کہ عورتوں نے قبر پر جاکر پتھر کو ڈھلکا یا ہوا پایا حالانکہ متی بیان کرتا ہے کہ فرشتوں نے عورتوں کے سامنے اسکو ڈھلکایا اور دیگر واقعات بھی جو مسیح کے جی اُٹھنے کے بعد متی کی انجیل میں مذکور ہیں وہ باقی اناجیل کے ساتھ مطابق نہیں۔ یہاں تک کہ آخری عشا اور صلیب کے دن کے بارہ میں بھی اختلاف ہے۔ یہی حال اقوال مسیح کا ہے ✤

ایسے اختلافات کی تشریح کے تین طریقے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس قسم کا کوئی اختلاف اور کسی قسم کی غلطی پائی نہیں جاتی۔ دوم اس قسم کی غلطیوں کو مانکر بائیبل کو ناقابل اعتبار ٹھیرانا اور کہنا کہ یہ لاغلط نہیں۔ سوم باوجود ان اختلافات کے یہ کہنا کہ بائیبل لاغلط ہے ✤

پہلی رائے پر اصرار کرنے سے بائیبل کی حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند ہوجاتی ہیں اور نقصان اور بے اعتقادی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری رائے نادانی پر مبنی ہے یا یہ کہو کہ لاغلط کی نسبت غلط فہمی پر موقوف ہے۔ تیسری رائے پختہ معلوم ہوتی ہے اور لاغلط کے بارہ میں صحیح خیال پیدا کرتی ہے۔

چنانچہ پروفیسر سٹیونس نے خوب فرمایا ہے کہ "بائیبل کے متعلق مباحثوں کے اور اُس پر حملوں کے باوجود مسیحی شخص کے دل میں پورا اطمینان رہے کہ بائیبل کی لاثانی سیرت مسیح کی شخصیت کی طرح بے داغ اور بے لوث ہے"

آجکل بعض یہ سمجھتے ہیں کہ علم جرح ( ) نے بائیبل کا اعتبار کھو دیا ہے۔ پارچات کہنہ کی طرح یہ صدیوں تک تاریکی میں محفوظ رہی اور مقدس سمجھی گئی۔ لیکن جونہیں دن کی روشنی انہیں لگی وہ پارہ پارہ ہو کر خاک میں مل گئے۔ لیکن بائیبل اور اُس کے لاغلط ہونے کی نسبت غلط فہمی سے اس قسم کا خیال پیدا ہوا حالانکہ تحقیقات جدید نے اور زمانۂ حال کے حملوں نے بائیبل کی صداقت کو اور بھی ظاہر کر دیا ہے۔ لفظی صحت اور لاغلط کے ایک ہی معنی نہیں۔ کیونکہ اگر ایک ہی معنے لئے جائیں تو ایک موہوم اور معدوم لاغلطی بائیبل سے منسوب کی جائیگی۔ لیکن بائیبل کے لاغلط ہونے کے صحیح معنے ظاہر ہو گئے ہیں اس لئے اب یہ صفت بائیبل سے علیحدہ نہیں ہو سکتی ۔

بعض عالم الٰہیات یہ کہتے ہیں کہ بائیبل کا ہر بیان بالکل صحیح اور غلطی سے منزہ ہے خواہ سائنس کا ذکر ہو خواہ تاریخ یا جغرافیہ کا وہ سراسر لاغلط ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہاج اور ڈاکٹر وارفیلڈ کی یہ رائے تھی کہ خدا نے ان مصنفوں کی مقدس نوشتوں کی تصنیف میں ایسی نگرانی کی کہ کوئی غلطی کی گنجائش نہ رہے اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر بائیبل میں ایک غلطی ثابت ہو جائے تو نہ صرف ہماری تعلیم کے خلاف ہو گا بلکہ بائیبل کے دعاوی کے بھی اور بائیبل کے الہام پر شک پیدا ہو گا۔ اور بعض تو یہاں تک مانتے تھے کہ انکی نجات ہی اس امر پر موقوف ہے کہ پیدائش کی کتاب سے لیکر مکاشفہ کی کتاب تک کوئی لفظی غلطی نہ ہو۔ لیکن شکر کی بات ہے کہ نجات اس قسم کی باتوں پر منحصر نہیں بلکہ ایک زندہ شخص پر ۔

بعضوں نے چند اختلافات دیکھکر عجیب تشریحیں پیش کی ہیں مثلاً اگر ایک

انجیل میں یہ ذکر ہے کہ یسوع نے یریحو میں داخل ہوتے وقت ایک اندھے کو شفا دی اور دوسری انجیل میں ہے کہ یریحو سے نکلتے ہوئے دو اندھوں کو شفا دی تو وہ یوں مطابقت دینا چاہتے ہیں کہ دراصل تین اندھوں کو شفا ملی ایک کو یریحو میں داخل ہوتے وقت اور دو کو وہاں سے نکلتے وقت ۔

اور بعض ایسے اختلافات کو سہو کاتب سے منسوب کرکے مشکل کو ٹال دینا چاہتے ہیں ۔ یہ بھی درست ہے کہ سہو کاتب سے کئی لفظی غلطیاں نام و تعداد وغیرہ میں داخل ہوگئیں لیکن ہر ایک اختلاف کو سہو کاتب سے منسوب نہیں کرسکتے ۔

ہمارے خیال میں اس قسم کے اختلاف سے وہ کتابیں ہماری نظروں سے نہیں گر جائینگی ۔ اگر کسی امر میں پولس اور پطرس کا اختلاف الرّاے ہو تو کیا اُس اختلاف سے ان کی عزّت گھٹ جائیگی ۔

الہام اور اُسکے نتائج کی نسبت غلط فہمی نے اکثر دلوں پر یہ اثر کیا ہے کہ وہ مقدّس نوشتوں کے مصنفوں کو لاغلط ماننے لگ گئے ۔

اَلہام روح اللہ کا دل میں بسنا ہے ۔ سب مسیحی مانتے ہیں کہ روح ہم میں بستا ہے لیکن وہ اپنے تئیں لاغلط نہیں سمجھتے ۔ اور بعض اشخاص جو مسیح کی روح سے پورے طور پر معمور تھے بالکل بے علم تھے ۔ پس ہم پہلے سے یہ نہیں جان سکتے کہ الہام کا کیا اثر مقدّس نوشتوں کے مصنفوں میں ہوگا ۔ صرف ان کی تصنیفات سے دریافت ہو سکتا ہے کہ خارجی اشیا اور غیر ضروری امور میں کہانتک ان کو صحیح علم بذریعہ الہام حاصل ہوا ۔ وہ اعلٰے درجہ کا الہام جیسا پولس کو حاصل ہوا مسیح کی عین قربت میں پہنچا دیتا ہے اور مسیح کے ساتھ شراکت رکھنے سے اُس کو صحیح علم اس بات کا قائل ہوا کہ روح کا صحیح ازلی رشتہ مسیح سے کیا ہے اور اسی علم کے باعث وہ دوسروں کے لئے مستند استاد ہوگیا لیکن روح القدس کا پولس یا ستیفنس جیسے اشخاص میں بسنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ ہر سنہ یا تاریخ یا چھوٹی چھوٹی تفصیلوں کے بیان کرنے میں ان سے چوک نہ ہو ۔

الغرض مقدس نوشتوں پر غور کرنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ الہام اور شے ہے لاغلط ہونا شے دیگر ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ سلاطین اور تواریخ کی کتابوں کے مصنف ملہم تھے گو ان میں کہیں کہیں اختلافات ہوئے ۔

اسی طرح اگر یہوداہ نے حنوق کی اپوکرفل کتاب سے اقتباس کیا جس کی تصنیف کو بہت عرصہ نہیں گزرا تھا اور اس پر کسی طرح کی جرح اور نکتہ چینی نہ کی تو اس سے یہوداہ کے الہام پر کچھ حرف نہیں آتا۔ بعض دیگر مصنف نئے عہدنامہ کی یہ توقع رکھتے تھے کہ مسیح جلد آنے والا ہے حالانکہ ہم اب تک اسکی آمد کے منتظر ہیں تو کیا ایسے قبل از وقت انتظار کے باعث ہم انکے الہام کو رد کردیں ۔

الغرض جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مقدس نوشتے لاغلط ہیں تو ہمارے یہ معنی ہوتے ہیں کہ جو ظاہرا اختلافات نظر آتے ہیں وہ بہت خفیف ہیں۔ اور اُن مصنفوں کی عام صحت اور راستی پر شک پیدا نہیں کرتے اور روزافزوں تحقیقات نے ان کی صحت اور سند پر مزید روشنی ڈال دی ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ گزرا کہ یہ اعتراض عموماً سُنا جاتا تھا کہ چوتھی انجیل کے مصنف نے مقامات کے بارہ میں بڑی غلطی کی ہے۔ لیکن فلسطین کی سیاحت اور دریافت نے اس اعتراض کو غلط اور بے بنیاد ثابت کردیا اور آج کوئی یہ اعتراض نہیں کرتا اور وہ اختلافات ایسے خفیف ہیں کہ ان کا ذکر کرتے بھی شرم آتی ہے۔ تو وہ برف میں وہ خفیف دراروں کی مانند ہیں جو چوٹی تک جانے والے کو سدراہ نہیں ہوتیں لیکن اگر کوئی شخص خواہ مخواہ جان بوجھکر اپنا پاؤں اُن دراروں میں زور سے ڈالے تو ضرور اُس کا ٹخنا مُڑ جائیگا ۔

پس جب کبھی ایسے اختلافات کا ذکر کرنا پڑتا ہے تو اُس کی ایک تو یہ وجہ ہے کہ ہم بائبل کے بارہ میں صحیح رائے رکھیں دوم اس امر کو ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ کیسے خفیف اور ہلکے ہیں اور نیز حقیقی اور جعلی لاغلطی کی امتیاز کے لئے ۔

لاغلط رہنما کی آرزو	مقدس نوشتوں کی نسبت حقیقی لاغلطی ثابت کرنے سے

پیشتر ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دین میں لاغلط رہنما کی تلاش کیوں بائبل میں کی جاتی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ عوام الناس خود ذمہ واری کا بوجھ اُٹھانے سے جھجکتے ہیں اور طرح طرح سے اپنا بوجھ دوسرے پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً قرعہ ڈالنا۔ دیوتاؤں سے مشورت لینا۔ اتفاقات زمانہ سے سبق سیکھنا۔ کسی سکہ کو پھینک کر اُسکے اُلٹے سیدھے سے یا کسی کتاب کے کھولنے سے فال وغیرہ نکالنا اسی غرض کے لئے ہے کہ ذمہ داری کسی دوسرے پر ڈالی جاسکے ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مباحثوں میں کسی ثالث اور منصف کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ جب تک کوئی شخص صرف بائبل ہی کو خدا کی راہ دریافت کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے تب تک کوئی ضرورت اُسے محسوس نہیں ہوتی کہ لاغلطی کے بارہ میں کوئی رائے گھڑنی چاہئے۔ وہ تو خدا کی تلاش کرتا ہے اور وہ خدا کو پا لیتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے خیالات دوسروں کو منوانا چاہتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ انکے ماننے میں وہ کیسے سست اور کاہل ہیں تب وہ ایسی سند کو پیش کرنا چاہتا ہے جسکے آگے سرخم ہو جاوے اور چون وچرا کو جگہ نہ رہے۔ لیکن اس کی تہ میں کم اعتقادی ہے ۔

علم کے دوسرے صیغوں میں لوگوں نے نہایت بیش قیمت وقت اور عمر یں خرچ کیں تاکہ سچ کو جھوٹ سے علیحدہ کریں۔ انہوں نے غلطیاں بھی کیں اور اُن غلطیوں کے نتائج بھی دیکھے اور ہزاروں جانیں ان غلط رائیوں کا شکار بھی ہوگئیں۔ لیکن شاید کوئی کہے کہ مذہب کا معاملہ ایسا سنجیدہ اور اہم نتائج سے پُر ہے کہ یہاں انسان کو شک میں رہنا نہیں چاہئے ہر ایک بات بالکل ثابت اور صریح ہو۔ لیکن یہ امر واقعی نہیں اکثر حصہ انسان کا تاریکی میں رہا اور خدا کی ہستی اور احسان کی شہادتیں ایسے لوگوں کو ملیں جو تلاش اور چھان بین کرنے غور و فکر کرنے اور عمل میں لانے کے لئے تیار تھے ؟ ہر طرح کی غلطی کے امکان سے اور اپنی عاقبت کے لئے فیصلہ کرنے کی

ذمہ واری سے بچنا ناممکن ہے۔ خواہ ہم کلیسیا کو اپنا لاغلط ہادی مانیں یا مقدس نوشتوں یا خود مسیح کو۔ یہ ہمارے انتخاب اور ہمارے فیصلے پر موقوف ہے۔ اپنے ارادہ اور فیصلہ کے سوا کوئی دوسرا ہمارے لئے فیصلہ نہیں کر سکتا۔ جب تک ہمارا اپنا کانشنس مسیح کی شخصیت اور الفاظ کو قبول نہ کرے ہم اُس کو اپنے لئے اعلٰے سند نہیں مان سکتے۔ دوسروں کی شہادت ہماری مدد کر سکتی ہے اناجیل کی ضرورت ہے کہ وہ ہم کو دکھائیں کہ وہ کیا ہے اور اُس کی حقیقی صورت کو اور اُسکے دعاوی کو ہمارے لئے محفوظ رکھیں۔ لیکن یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اپنے لئے فیصلہ کریں کہ آیا یہ شخص ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ دعوےٰ کرتا ہے ؎

لاغلط ہونا کیا ہے

اب ہم مطلب پر آئے کہ یہ کس قسم کی لاغلطی ہے جو ہم مقدس نوشتوں اور خاص کر اناجیل سے منسوب کرتے ہیں؟ کیا صرف ونحو میں لاغلطی۔ یا طرز بیان یا تاریخ یا سائنس یا کسی اور شئے میں لاغلطی؟ یاد رکھئے کہ یہ لاغلطی کتاب کے مقصد پر موقوف ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ گھڑی لاغلط ہے تو وہ وقت کے بتانے کے لحاظ سے ایسی ہے نہ اس میں کہ اُس کا شیشہ یا پیتل وغیرہ بے نقص ہے یا یہ کہ وہ کل کے بارہ میں موسم وغیرہ کے بتانے میں لاغلط ہے جہازران کے لئے اُس کا نقشہ لاغلط ہے کیونکہ وہ ٹھیک ٹھیک بتاتا ہے کہ یہاں لائٹ ہوس ہے۔ وہاں پانی تھوڑا ہے یا بہت۔ یا اُس جگہ چھپی چٹان ہیں وغیرہ لیکن وہ نقشہ وقت وغیرہ کے بارہ میں کچھ نہیں بتاتا۔ یہی حال بدرقہ کا ہوتا ہے کہ وہ آپ کو دشوار گزار دروں اور پہاڑوں میں ٹھیک جگہ پر لیجائے اگرچہ اس کو سوائے اپنی زبان کے دوسری زبان نہ آتی ہو اور سوائے اپنی پہاڑی کے دوسرے پہاڑوں کا علم بھی نہ ہو ؎

پس ہمیں اول یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ بائیبل کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسیح کو منکشف کرے۔ چنانچہ خود ہمارے خداوند نے

یہی کہا" یہ وہی ہیں جو میری گواہی دیتے ہیں" اِن نوشتوں کے ذریعے خدا کی نجات بخش محبت کا علم دُنیا کو پہنچایا جاتا ہے۔ خدا کا منشا یہ نہ تھا کہ بائیبل کے ذریعے سائنس یا قوموں کا علم یا آیندہ جہان کا علم سکھائے اگرچہ انسان بہت کچھ یہ جاننا چاہتے ہیں بلکہ اُس کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کے سامنے مسیح کو زندگی بخش فضل اور عظمت سے معمور پیش کرے اور زمین پر اس علم کو مداومت بخشے۔ مسیح میں ہم کو خدا کا نہایت اعلےٰ مکاشفہ ملا ہے اور اگر مقدّس نوشتے مسیح کا کافی علم ہم کو بخشتے ہیں تو اُس کا مقصد پُورا ہوا۔ چنانچہ لوتھر نے ٹھیک کہا تھا کہ" ہم اُس کو نوشتہ نہیں کہتے جو مسیح کو ظاہر نہیں کرتا"۔

مقدّس نوشتوں کے بارہ میں جب یہ رائے صاف ہوگئی تو فوراً یہ معلوم ہو جائیگا کہ جو اختلافات انجیل میں یا بائیبل کے دوسرے حصّوں میں ہوں وہ بلحاظ اس مقصد کے کہ بائیبل مسیح کا بیان کرتی ہے کچھ وقعت نہیں رکھتے اور نہ اس مقصد میں ہارج ہیں۔ ہر انجیل ایک ہی مسیح کو منکشف کرتی ہے۔ اور عام مطابقت جو ان اناجیل میں پائی جاتی ہے وہ ان کی صحت پر دال ہے اور کسی معمولی مسیحی کو ان اناجیل میں سے مسیح کا تصور نکالنے میں کبھی کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ جب تک کہ عام مقصد میں کچھ نقصان نہیں ہوتا اختلافات اور لفظی غلطیاں نوشتوں کے لاغلط ہونے میں ہرج نہیں ڈالتیں اور اسکے دو سبب ہیں:-

اوّل۔ تفصیل میں غیر ضرور غلطیوں سے کبھی کسی مورخ کے اعتبار کو بٹا نہیں لگا۔ یہ قانون کہ جو ایک بات میں غلط ہے وہ ساری باتوں میں غلط ہے عدالتوں میں ایسے گواہ پر صادق آتا ہے جو دانستہ قصداً سچائی کو بگاڑتا ہے۔ جب کسی گواہ سے سچ سچ بولنے کی قسم لی گئی اور وہ فریب دینے کے ارادہ سے سچائی کو چھپا رکھتا اور بگاڑتا ہے لاکلام اُس کی ساری شہادت ناقابل اعتبار ہوگئی۔ لیکن قانون زندگی کے روزمرّہ امور یا تاریخ نویسی پر

عائد نہیں ہوسکتا۔ کون بشر ایسی غلطیوں سے مبّرا رہا۔ ٹے سی ٹس مورخ نے غلطی کھائی لیکن اس سے ہم اُس کی ساری تاریخ کو ردّ نہیں کردیتے اور شاید کوئی تاریخ نویس ایسا نہ نکلیگا جس نے کچھ نہ کچھ غلطی نہ کی ہو۔ لیکن اتفاقی بلاارادہ اور غیرضروری امور میں غلطی کرنا عام صحت اور درست بیانی کے سامنے نظرانداز اور فراموش ہوجاتا ہے ؞

دوم۔ شاید کوئی کہے کہ جب الٰہی تعلیم اور ابدی امور کا ذکر ہے وہاں ہر ایک غلطی اہم ہے خفیف نہیں۔ جواب یہ ہے کہ نہیں۔ ورنہ خدا ایسا انتظام کرتا کہ کسی قسم کی کوئی غلطی وقوع میں آہی نہ سکتی۔ جب کسی غلطی سے عام مقصد میں نقصان واقع نہیں ہوتا تو وہ غلطی خفیف اور غیرضروری ہے۔ جب تک کسی عبارت کے معنی صاف ہوں صرف و نحو کی غلطی کا مضائقہ نہیں۔ اسی طرح بائیبل میں جب تک کوئی غلطی ایسی نہ ہو کہ مسیح میں جو مکاشفہ خدا کا ہوا ہے اس کے علم کے محفوظ رکھنے میں نقصان پہنچائے تب تک وہ غلطی خفیف سمجھی جائیگی۔ سوال ہمیشہ یہ رہیگا کہ آیا بائیبل اپنا مقصد پورا کرتی ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم خدا کو مسیح میں پہچانیں اور اُس تک پہنچیں۔ اس میں کلام نہیں کہ بائیبل نے انسان کو مسیح کی طرف ہدایت کی ہے۔ اس لئے مسیح نے جو فرض اس کا ٹھہرایا اُس کو اُنھوں نے پورا کیا۔ اُنھوں نے انسان کے سامنے مسیح کو پیش کیا جس میں خدا ملتا ہے ؞

بائیبل پر شہادت

شاید مذکورہ بالا بیان کی تصدیق میں ایک دو شہادتوں کو پیش کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ گزشتہ صدی میں ایک مشہور عالم آزاد طبع گزرا ہے جو دوسروں کی رائوں اور عقیدوں کا پابند نہ تھا وہ یہ کہتا ہے کہ "جس سے خدا کھو گیا ہے وہ اُسے پھر اس کتاب میں پا سکتا ہے اور جس نے کبھی اُسے جانا ہی نہ تھا وہ الٰہی کلام کا سانس یہاں محسوس کرسکتا ہے۔" جب ڈاکٹر مارٹینو اناجیل سے اپنے ہاتھ دھوچکا تو بھی یہ کہنے پر وہ مجبور ہوا "کوئی ناواقف ہونے کا بہانہ نہیں

کر سکتا کہ مسیح کیا تھا۔ جو کچھ اُس کا بیان ہمارے پاس پہنچا ہے اُس سے اُس کی شخصیت صاف نظر آتی ہے کہ کوئی تاریخ یا فسانہ بھی ایسا نہیں دکھا سکتا۔ رابرٹسن سمتھ صاحب لکھتے ہیں کہ "جب تک ہم بائبل کے پاس خدا کو اور اُسکی نجات بخش محبت ایمان کی آنکھوں سے ڈھونڈھنے جائینگے ہم یقین رکھیں اس کے ہر حصہ میں لاغلط تعلیم اور شہادت ملیگی اور اس کے سوا اور کچھ نہ ملیگا۔۔۔ چونکہ بائبل کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ ہمیں پیغام پہنچائے اور جب اسکے ساتھ روح کی اندرونی شہادت شامل ہو تو یہ بائبل اپنے تئیں خدا کا لاغلط کلام ظاہر کرتی ہے اس لئے عملی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بائبل خدا کا لاغلط کلام ہے"۔

بائبل کا معیار

ہم کیوں بائبل کو خدا کا کلام مانتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ کلیسیا اس کی تصدیق کرتی اور ہمیں یقین دلاتی ہے کہ میں لاغلط ہوں؟ لیکن کلیسیا خود لاغلط نہیں اور جیسا دیگر امور میں اس نے غلطی کی ہے شاید اس امر میں بھی کی ہو۔ یا اس لئے کہ بائبل خود اپنے لاغلط ہونے کا دعوےٰ کرتی ہے؟ لیکن بائبل تو ایسا دعویٰ نہیں کرتی اور اگر ایسا دعویٰ کرتی تو میں کیسے جانتا کہ میں اس پر ایمان لاؤں۔ نبیوں نے خدا کے رسول ہونے کا دعوےٰ کیا لیکن وہ جھوٹے ثابت ہوئے۔ صرف ایک ہی قطعی دلیل بائبل کو کلام اللہ ماننے کی ہے وہ یہ ہے کہ جو سچائی کی تعلیم یہاں دی گئی اُس میں کچھ ایسی بات ہے کہ مجھے یقین دلاتی ہے کہ خدا اس کا مصنف ہے یعنی انسان کی اپنی تمیز اور کانشنس کا یہ فیصلہ ہے کہ اس میں خدا اُس سے ہمکلام ہے۔ اگر مسیح میں اور اسکے مکاشفہ میں یہ فی البدیہ قوت نہ ہو تو اور کوئی شہادت مل نہیں سکیگی۔

اکثر مسیحی اب تک اسکے سمجھنے میں قاصر رہے ہیں کہ مسیح کی صداقت اور سند علم جرح کے دائرے سے باہر ہے وہ اپنی شہادت خود ہے۔ اور یہ شہادت مقدس نوشتوں کے الہام یا لاغلط ہونے کی کسی رائے پر منحصر نہیں

مسیح نے خدا کا ایسا اعلےٰ تصور ہمیں عطا کیا ہے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی کو حاصل نہ تھا اور جب کانشنس کا اس سے تعلق آپڑتا ہے تو اُسے سرِتسلیم خم کر کے یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس سے اعلےٰ شخص اور مردِ خدا اور کہیں مل نہیں سکتا۔ اناجیل میں اُس کا تصوّر صاف صاف نقش کیا گیا ہے اور وہ تصور اُن مصنفوں کی لیاقت اور علم سے کہیں اعلےٰ اور افضل ہے۔ جو کوئی اناجیل کا مطالعہ کرتا ہے اُس کو خدا کا یہ علم حاصل ہوتا ہے اور یہ علم ہمیشہ کی زندگی ہے ؂

الغرض گو بائبل لفظی طور پر لاغلط نہ ہو لیکن روحانی ہادی ہونے کے بارہ میں تو لاغلط ہے۔ ہم جو اس کو خدا کا کلام مانتے ہیں وہ اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی لفظی غلطی نہیں بلکہ اس لئے کہ ہم اس میں خدا کی آواز محسوس کرتے ہیں زندہ خدا ہماری نجات کا خدا ان نوشتوں میں ہم سے مسیح کا ذکر کرتا ہے۔ کوئی انسان مصنف کیوں نہ ہو اُس نے اپنا دل اور ہاتھ اور اپنے آپ کو اس کی خدمت میں مخصوص کر دیا ؂

بعض یہ سوال کرتے ہیں کہ جب بائبل کو لفظی طور پر لاغلط نہیں کہہ سکتے تو کیونکر مان سکتے ہو کہ وہ بلا غلطی مسیح کی طرف ہم کو لے جائیگی اگر ہمارے پاس کوئی لاغلط تحریر نہیں تو لاغلط مسیح کا بھی یقین نہیں۔ اس کا جواب گزر چکا ہے کہ ہم بائبل کو کس معنی میں لاغلط کہتے ہیں۔ ایک جہازران جس نے کبھی جہاز کا نقصان نہیں اُٹھایا جہازرانی میں عملی طور پر لاغلط کہلا سکتا ہے۔ اگرچہ وہ کئی ایک عجیب دریائی جانوروں کا یقین رکھتا ہو جو کبھی موجود ہی نہ ہوں۔ یا جس نے کبھی کرامویل۔ ملٹن یا واشنگٹن جیسے مشہور اشخاص کا ذکر بھی نہ سُنا ہو۔ اور شاید یقین رکھتا ہو کہ برانڈی ہر بیماری کا علاج ہے ؂

بعضوں نے اکثر یہ سوال کیا کہ اگر بائبل میں ذرا بھی غلطی ہو تو ہم کیسے دریافت کریں کہ یہ سچ ہے اور یہ غلط ہے۔ جواب میں صرف اتنا

کہنا کافی ہے کہ ہر شخص جو بائبل کا مطالعہ کرتا ہے وہ یہی کر رہا ہے۔ خروج کی کتاب کو پڑھیں یا احبار کی کتاب کو کون ہمارے ساتھ رہتا ہے جو ہمیں بتاتا جاوے کہ اس میں کونسا مضمون دائمی ہے اور کونسا صرف موسےٰ کے زمانہ کے لئے تھا۔ یا جب ہم پیدائش کی کتاب یا سلاطین کی کتاب پڑھتے ہیں کون ہمارے کان میں پھسپھساتا ہے کہ یہ قابل نمونہ ہے اور یہ قابل نمونہ نہیں وغیرہ۔ جب یہ حال نہیں تو ہم کیوں نادان سے نادان کے ہاتھ میں بائبل دیکر کہتے ہیں کہ اپنے لئے روحانی غذا نکال۔ پولوس نے اس مشکل کو یوں حل کیا ہے "روحانی شخص (یعنی جس میں مسیح کی روح ہے) سب باتوں کو پرکھ لیتا ہے۔ پس یہ کسوٹی اور مقدس نوشتوں کا حقیقی معیار ہے جسکے ذریعے ساری چیزیں پرکھی جاتی ہیں۔ ایک مسیحی عالم نے یہ بیان کیا ہے کہ" یہ وہی روح ہے جس نے سچائی کو بائبل میں مجسم کردیا ہے اور یہی روح مسیحی شخص میں سچائی کی محبت پیدا کردیتی ہے اور اس میں کچھ ایسی کشش مقناطیسی ہے کہ جہاں سچائی ملتی ہے روح خودبخود اس کی طرف کھنچ جاتی ہے اور حقیقی متلاشی آخرکار ایسی ساری سچائی بائبل میں پائیگا "

الغرض جو شخص صدق سے تلاش حق کے لئے بائبل کو پڑھیگا بائبل اُس کو کبھی گمراہ نہ کریگی۔ انسان روحانی ہادی کا متلاشی ہے اور تم بائبل بلاشک وشبہ اُس کے سپرد کرسکتے ہو اور اگر کوئی شخص علم ارض یا فلسفہ وغیرہ سیکھنا چاہتا ہے اور بائبل میں اس کی تلاش کرتا ہے تو وہ دوسری کتابیں پڑھے لیکن اگر وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ مسیح کے لئے تاریخ دُنیا میں کیسے تیاری ہوئی تو وہ بائبل کو پڑھے۔ اگر کوئی جاننا چاہے کہ خدا کا جہان سے اور اُس کی زندگی سے کیا رشتہ ہے تو وہ پیدائش کی کتاب پڑھے۔ اگر وہ مسیح کے زمانے کا حال جاننا چاہتا ہے تو وہ دیگر کتابوں کا مطالعہ کرے۔ لیکن اگر وہ مسیح کو جاننا چاہتا ہے اور اُسکے وسیلے

باپ کو تو وہ اناجیل کو پڑھے پس جو کوئی خدا کے پاس پہنچنے کے لئے لاغلط ہادی کی تلاش کرتا ہے تو بائیبل ایسا ہادی ہے - بائیبل سائنس اور تاریخ کی کتاب نہیں بلکہ دینی ترقی اور خدا کی پہچان کی کتاب ہے اور وہ ان صفحوں میں لاکلام ملتی ہے ؞

چھٹا باب

اناجیل کا معتبر ہونا

چونکہ آجکل تحقیقات کا نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور جدید دریافتوں کا مزید سامان مہیا ہوگیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جدید طریقے یعنی تاریخی جرح کے ذریعے جسے آج کل ہائر کرٹی سزم (Higher Criticism) کہتے ہیں اور جدید دریافتوں کے وسیلے اناجیل کو پرکھیں - یہ طریقہ دراصل نیا تو نہیں لیکن ان دنوں اس کا چرچا بہت ہوگیا اور اس پر بہت زور دیا جاتا ہے - اور یہ طریقہ بہت درست ہے اور اگر اس کے بارے میں کچھ تعصب ہے تو اس کی حقیقت اور مقاصد اور اسباب کی نسبت غلط فہمی کے ذریعے ہے - بعض لوگ تو اسے مسیحی دین کا دشمن کہتے ہیں لیکن یہ اس کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے - طریقہ برا نہیں - یہ باقاعدہ دستہ ہراول کی طرح ہے - جو آگے آگے جاکر ہر طرح کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا اور راہ راست کا پتا لگاتا ہے - اس لئے ہم اسکو مرض متعدی سمجھکر اس سے دور نہ بھاگیں بلکہ صحت و آرام کی جگہ کے طور پر اس کا خیر مقدم کہیں - کیونکہ تاریخی سچائی کی تحقیق کا یہ نہایت پسندیدہ طریقہ ہے - اور ہر متلاشی حق کم و بیش اس کی دستگیری کا خواہاں ہے - ہر شخص کسی نہ کسی معیار کو رکھتا ہے جسکے ذریعے وہ اپنی

شنید اور مطالعہ کو پرکھتا ہے۔ اور اسکے ذریعے فیصلہ کرتا ہے کہ آیا میں اس کو مانوں یا نہ مانوں۔ اگر کوئی ملاح آنکر کہے کہ قطبین پر جہاں بارہ مہینے یخ بستہ رہتی ہے نارنگیاں پیدا ہوتی ہیں تو ہم فوراً کہینگے کہ یہ غلط ہے کیونکہ اس کے بارے میں جو علم ہم کو حاصل ہے وہ اسکے خلاف ہے۔ ویسے ہی اگر کوئی کتاب یہ دعوےٰ کرے کہ میں ملکہ اَین (Q. Anne) کے وقت کی تصنیف ہوں اور برقی روشنی۔ ٹیلیفون یا فونوگرافی وغیرہ کا بلا روک ٹوک ذکر کرے تو ہم فوراً کہینگے کہ اُس کا دعوےٰ غلط ہے۔ الغرض ہر شخص بالذاتہ علم جرح رکھتا ہے۔ اور علم جرح سائنس کی حیثیت میں اُن سارے معیاروں کو جمع کرتا اور استعمال کرتا ہے جن کو تجربہ نے بہم پہنچایا ہے۔ کہ فلاں کتاب کی تاریخ کیا ہے۔ سیرت کیا ہے۔ کہاں تک وہ معتبر ہے اور اُس میں کون سے بیان کو صحیح اور تاریخی سمجھیں اور کون سے بیان کو جعلی اور تصرف قرار دیں۔ اس لئے بغیر علم جرح کے ہم اناجیل یا دیگر قدیم کتابوں کے بارہ میں ٹھیک تحقیقات نہیں کرسکتے +

لیکن سامان جدید اس نئے طریقہ سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ ماضی کے علم کے بارہ میں جو سامان ہم کو اس وقت مہیا ہوگیا ہے وہ ہمیں کبھی حاصل نہ تھا۔ علم عمارت قدیمہ۔ تاریخ۔ علم انسان وغیرہ نے اس مضمون پر بہت روشنی ڈال دی ہے۔ عمارات قدیم کے کھود نکالنے سے بہت پرانی باتوں کا علم حاصل ہوگیا ہے۔ قدیم کتبوں۔ یادگاروں۔ مدفون شہروں کے ملنے اور مصری کاغذوں سے ہزاروں نسخے دستیاب ہونے ( )
اور دریائے فرات کی وادی میں سے اینٹوں کے کتب خانے ہاتھ لگنے کے ذریعے ایسی روشنی حاصل ہوئی کہ پہلے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ پیدائش کی کتاب کے بیانات کے مشابہ بہت قدیم قصے ملے ہیں جن سے اُس کتاب کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ قدیم معدوم شدہ قوموں کے پتے لگنے سے بھی مقدس نوشتوں کے علم کی زیادہ توضیح ہوگئی ہے +

اناجیل کے مطالعہ میں اب ہم اُن باتوں کا ذکر کریں گے جو یا تو حال ہی میں پہلی دفعہ معلوم ہوئی ہیں اور یا ان کا جواب تک نظر انداز ہوتی رہی تھیں مسئلہ ارتفاع معجزوں کا نیا دشمن پیدا ہوا۔ کیونکہ اس مسئلہ کا مقتضے یہ ہے کہ دنیا میں کوئی واقعہ نہیں جس کے اسباب پہلے سے موجود نہ ہوں۔ علت معلول کے سلسلہ میں کوئی مداخلت نہیں ہو سکتی اور باہر سے کوئی شے دخل نہیں پا سکتی۔ مقدسوں اور بانیانِ دین کی سوانح عمریاں پڑھنے سے اس انکار معجزات کی تردید ہوتی ہے۔ کیونکہ معجزے نہ صرف یسوع اور اس کے شاگردوں سے منسوب کئے گئے بلکہ بدھ۔ باب۔ ٹامس آکبٹ اور فرانسس آسسی اور دیگر لوگوں سے بھی منسوب ہوتے ہیں۔ ان مدعیان معجزات کے دعاوی کی تحقیقات شروع ہوئی اور مزید ثبوت کی ضرورت پڑی۔

بعض علما کہتے ہیں کہ تہذیب کے ایک خاص زمانہ میں کل بیماریاں آسیب جن بھوت سے منسوب کی جاتی تھیں اور جب تہذیب نے کچھ اور ترقی کی تو صرف خاص خاص بیماریاں مثل فالج اور جنون کے آسیب سے منسوب ہوئیں اور بعض ممالک میں اب تک۔ لوگ جادو کیا کرتے ہیں۔ ہم صرف یہ کہکر ان امور سے کنارہ نہیں کر سکتے کہ جن دیوزدگان کا ذکر اناجیل میں آیا ہے وہ مختلف قسم کے ہیں۔

دیگر مذاہب کی مقدس کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ لوگوں پر ایک خاص اثر ہوا کیونکہ ان کتابوں میں بائبل کی نسبت الہامی اور لاغلط ہونے کے بارہ میں زیادہ زور سے دعوےٰ کیا گیا ہے اور یہ سوال معقول طور سے پوچھا جاتا ہے۔ کہ ان مذاہب کے ان دعاوی کو ہم کیسے رد کریں۔ کوئی ایسی دلایل پیش کریں جو اُلٹ کر ہم ہی پر عاید نہ ہوں؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا مسیحی کتابیں ویسی ہی غیر معتبر سوانحہ عمریاں ہیں جو بعض بڑے بڑے نامی اشخاص کی مبالغہ کے ساتھ لکھی جاتی ہیں یا جیسے محمد اور باب کے کارناموں اور تعلیموں کے تذکرے ہیں۔ یا ان میں

ایسی راستی اور صحت پائی جاتی ہے کہ خواہ مخواہ ان کا اعتبار ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہر لفظ کا نہیں تو کم سے کم اُس تصویر کا جو یسوع کی اُنہوں نے کھینچی ہے +

یہ درست نہ ہوگا کہ ہم یہ کہکر اس ساری تحقیقات کو بند کر دیں کہ یہ کتابیں الہامی ہیں اس لئے ہر طرح کی غلطی سے مبرا ہیں اگر وہ صحیح اور لاغلط ہیں تو تحقیقات سے جھجکنا نہیں چاہئے۔ لیکن جو اناجیل ہمارے پاس ہیں ان میں کہیں نہیں لکھا کہ ہم الہامی، یا، لاغلط ہیں۔ صرف ایک انجیل میں لکھا ہے کہ مصنف نے مضامین مندرجہ انجیل کن وسائل سے حاصل کئے اور اُن کے بارہ میں اس نے کیسی تحقیقات سے کام لیا۔ لیکن بالفرض اگر ہر انجیل میں یہ لکھا ہوتا کہ میں الہامی ہوں تو بھی ہمارے سوال کا جواب اُس سے حاصل نہ ہوتا۔ روح اللہ کا کسی کے اندر بسنا اس کو ہمہ دان نہیں بنا دیتا۔ بلکہ انسانی تاریخ یا سائنیس کا علم بھی نہیں دیتا۔ یہ صرف اناجیل کی تحقیقات ہی کے ذریعہ دریافت ہوسکتا ہے۔ کہ وہ کہاں تک معتبر ہیں۔ محض الہام کے دعوے پر ایسی تحقیقات کو ترک کرنا بے سود کوشش ہے۔ وہ زمانہ جاتا رہا اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ لوگ خود تحقیقات کرینگے اور اناجیل کی صحت کو پرکھیں گے کیونکہ وہ حق کی تلاش کیا چاہتے ہیں۔ خدا کا جہان ترقی کا جہان ہے۔ سیلاب چڑھ رہا ہے اور جو آگے نہیں بڑھتا۔ اور اپنی جگہ ضد سے کھڑا رہتا ہے ضرور غرقاب ہوگا۔ ہمیں چاہئیے کہ خدا کی ہلاہٹ کو قبول کریں۔ اور جہاں حق ہم کو لے جایا چاہتا ہے بے خوف وخطر چلے چلیں +

الہامی کتاب کی قدر ومنزلت اس کے دو نتائج پر مشتمل ہے (۱) یسوع کے کام کا ذکر اسی روح سے لکھا گیا ہے جس میں کہ وہ عمل میں آیا تھا اور وہ بھی ایسے اشخاص نے قلمبند کیا ہے جو اُس کی طبیعت اور ارادہ سے ہمدرد تھے۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ اناجیل میں اُس کی زندگی کے انہیں امور پر زور دیا گیا ہے جنہیں وہ خود اس قابل سمجھتا تھا۔ اُس کا کچھ ذکر نہیں کہ اسکے

بالوں کا رنگ کیا تھا کہ وہ کیسے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ اور اُس کے بدنی خال وخط کا بھی ذکر نہیں۔ اور وہ مصنف یہ دیکھکر حیران ہوئے کہ آج کل لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیسا زور دیتے ہیں۔ لیکن ان کا الہام ہمیں اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ اگر یسوع ہی مسیح تھا تو وہ ظاہر کرنا چاہیے اور اگر اُسنے گناہ سے مخلصی دینے کا دعوےٰ کیا تو اس کو درج کرنا چاہئے۔ اور (۲) وہ ہمیں اس کا بھی یقین دلاتا ہے کہ اُن کے بیان میں کوئی غلطی عمداً داخل نہیں ہوتی۔ جیسا وہ مسیح کو مانتے تھے ویسا اُنہوں نے اُس کا بیان کیا۔ اس میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے لیکن جان بوجھ کر تو اُنھوں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ جب یہ مصنف جانتے تھے کہ کیسا اعلیٰ مضمون ہم لکھ رہے ہیں۔ تو وہ بلا تحقیق نہ لکھیں گے۔ ان کتابوں میں مصنفوں نے اپنی نسبت بہت ہی کم لکھا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے تئیں عوام الناس کے قرضدار سمجھتے تھے اور اپنی اس ذمہ واری کو اُنہوں نے لایق طور سے سرانجام دیا۔

آج کل زمانہ تحقیقات اور نکتہ چینی کا زمانہ ہے۔ نہ صرف دینی کتابوں کی چھان بین کی جاتی ہے۔ بلکہ دیگر قدیم کتابوں کی بھی لیکن اس تحقیقات میں دو باتوں کی خبرداری کرنی چاہئے۔ (۱) آج کل کے محقق جن کا بڑا اثر پبلک راے پر ہے وہ کبھی کبھی انوکھی باتوں کو پیدا کرنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں یا ممکنات کو ظنون غالبہ کا درجہ دیتے ہیں۔ اور ظنون غالبہ کو یقین کا درجہ (۲) آج کل کے نکتہ چین یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ قدیم لوگ تحقیقات کے قوانین سے بالکل ناواقف تھے اور شہادت کے قوانین سے بے بہرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم قدیم تصنیفات کی تحقیقات تعصب سے کرتے ہیں اور یوں پورا انصاف نہیں کرسکتے۔ اس لئے ہم اس قبل از تحقیق تعصب سے خبردار رہیں +

لیکن جو لوگ ارسطو کی تصنیفات اور ڈیماستھینز کی تقریروں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مصنفوں کے لئے یہ ہدایات ہیں کہ وہ اتفاقی

شہادت چشم دید شہادت اور محض قیاس کے مابین امتیاز کریں اور یونان اور روم کی عدالتوں میں یہ قوانین برتے جاتے تھے اور ہماری اناجیل کی تصنیف سے دو سو برس پہلے مورخ اس سے واقف تھے کہ تحریر کا اعتبار کس امر پر مبنی ہے چنانچہ پولی بی اس (Polybius) نامی اپنی کتاب کے دیباچہ میں بیان کرتا ہے کہ میں یہ تاریخ ۲۲۰ قبل از مسیح سے شروع کرتا ہوں کیونکہ اس زمانہ کا کچھ حصہ تو میرے والدین کے ایام میں پڑے گا اور کچھ میرے ایام میں اور یوں کچھ تو میں خود عینی گواہ کے طور پر بیان کرسکوں گا اور کچھ عینی شہادت کے زور پر۔ اس سے پرے جانا اور رپورٹ کی رپورٹ لکھنا ایسی حدیثوں کو نقل کرنا جو سنی سنائی ہیں تسلی بخش نہیں۔ نہ تو ان سے کسی امر کی وضاحت ہوتی ہے۔ اور نہ صحیح بیان نکلتا ہے۔ پولی بی اس کی تاریخ پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کیسی دانائی اور روشن ضمیری سے کام لیا اور مورخوں کے جالوں اور پھندوں سے کیسے بچا اور کن کن وسائل سے اس نے مصالح حاصل کیا۔ چنانچہ اس نے اپنے سے پہلے دو مورخوں کے بارہ میں یہ لکھا ہے "میں یہ نہیں کہتا کہ ان مصنفوں نے ارادتاً غلط بیان کیا۔ لیکن میری رائے میں وہ اسی حالت میں تھے جس میں ایک عاشق ہوتا ہے۔ طرفداری اور ماقبل تعصبات کے باعث (Philinus) فلی نس نے اہل کارتھج کے سارے اعمال کو حکمت شجاعت اور عزت سے منسوب کیا اور اہل روما کے اعمال کو اس کے برعکس سمجھا۔ فے بی اس نے اس سے الٹا نتیجہ نکالا۔ زندگی کے دیگر کاروبار میں اس قسم کے خیالات کو آدمی ملامت نہیں کرتا کیونکہ نیک لوگوں کو چاہئے کہ اپنے دوستوں سے وفادار رہوں اور محب وطن ہوں تحسین اور نفرت میں دوستوں کے ساتھ ان کا اتفاق ہو۔ لیکن جونہیں کوئی شخص مورخ ہونے کی خدمت اختیار کرتا ہے تو اسے ایسے خیالات کو بالکل بالائے طاق رکھنا چاہئے۔ جیسے کسی جانور کی آنکھیں نکال لینے سے وہ جانور بیکار ہو جاتا ہے

ویسے ہی اگر تاریخ سے صداقت کو جدا کرو تو وہ گپ شپ سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتی +
پس محقق خبردار رہے اور حال و ماضی کے طریقوں کے درمیان نامعقول فرق نہ کرے اور یہ تعصب اس کے دل میں نہ ہو کہ ان انجیل نویسوں نے بلا تحقیقات اور امتیاز جو کچھ سنا وہ لکھ دیا۔ لیکن تیسری اور چوتھی انجیل کے مصنف چشم دید شہادت کی قدر کرتے ہیں اور نہ صرف خود اس کو وقعت دیتے بلکہ مسیحی جماعت اُس کی قدر کرتی تھی۔ پس اناجیل کی تحقیقات سے پیشتر یہ تعصب دل میں نہ ہونا چاہیے۔ کہ ان کے مصنف زود اعتقاد اور ناقابل تھے۔ کہ جو کچھ سنا لکھدیا اور جس سے اُن کے اُستاد کی عزت بڑھ سکتی تھی اس کو نقل کر دیا +

اس تحقیقات میں ہم یہ یاد رکھیں کہ اناجیل کے اعتبار سے ان کی لفظی صحت مراد نہیں بلکہ اس ارادہ کی تکمیل کہ مسیح کی صحیح تصویر کا نقشہ کھینچیں۔ اور ہم نے شروع سے یہی دعوے اناجیل کے لئے کیا ہے کہ ان میں اس کی صحیح تصویر جس کی خدمت کا وہ بیان کرتی ہیں۔ یہ تصویر کوئی ہم سے چھین نہیں سکتا۔ کسی آیت پر شک ہو تو ہو کسی واقعہ میں کوئی مشکل ہو تو ہو لیکن اس تصویر میں کچھ کلام نہیں۔ اور ان اناجیل کا مقصد یہی ہے کہ اس تصویر کو محفوظ رکھیں۔ تصویر فوٹوگراف کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے یا ہاتھ کے ذریعہ سے لیکن اس سے یسوع کی وہ تصویر حاصل ہوتی ہے جو اُس کے رفیق سمجھتے تھے تو یہ ہمارے لئے کافی ہے +

اناجیل میں جو کچھ لکھا ہے اُس کو لفظ بلفظ ماننا تو ان علما کے لئے مشکل ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم خلوص دلی سے تحقیقات نہ کریں۔ اس امر میں جن مشکلات سے سامنا پڑتا ہے اُن کو ہم چار حصوں پر تقسیم کر سکتے ہیں (۱) زبانی روایات کا صحیح سالم دوسروں تک پہنچنا عموماً مشکل ہے۔ (۲) کسی بہادر اور خاصکر مسیح کی تاریخ میں کسی قسم کے افسانہ کو داخل کرنے کی طرف میلان (۳) اس امر کا اندیشہ

اور امکان کہ مصنف کی اپنی رائے سے اس کے بیان میں کچھ حاشیہ بڑھایا جائے (۴) یہ بھی دیکھا گیا کہ پہلی تین اناجیل کئی باتوں میں اختلاف رکھتی ہیں نہ صرف چھوٹی باتوں میں بلکہ بعض بڑی باتوں میں بھی شلاً مسیح کی قیامت کے بعض بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔

(۱) پہلے تو ہم اس امر کو لیں کہ روایات جو ایک سے دوسرے تک زبانی پہنچتی ہیں ان میں رفتہ رفتہ کچھ زاید مصالح مل جاتا ہے یہ تو واضح ہے کہ جن واقعات کا ان اناجیل میں ذکر ہے اُن کے واقعہ ہونے سے تقریباً ایک پشت بعد وہ لکھے گئے ۔ اور اس اثناء میں یسوع کا بیان زبانی ایک سے دوسرے تک پہنچتا رہا ۔ اگر یہ بیان اس پشت میں کلیسیا کی مشترک میراث رہا اور اگر اس عرصہ میں ہر شخص اپنے پڑوسی سے اپنے حسب علم اور خیال یہ مضمون بیان کرتا رہا ۔ والدین اگر اس ٹھوس خوراک کو بچوں کے حسب حال نرم کرتے رہے اور واعظ اپنے سامعین کی حسب ضرورت اس کو شکل دیتے رہے تو کیا یہ ظن پیدا نہیں ہوتا کہ اثنائے راہ میں اس روایت میں کچھ ملاوٹ مل جائے ۔ اور جیسا کہ اوریلو کون (Orello Cone) نے کہا کہ یہ ماننا یسوع کی روایت جو ایک مقررہ صورت اختیار کرنے سے پیشتر بہت ہاتھوں میں گزری اُس میں کچھ کمی بیشی نہ ہوئی ناقابل اعتبار ہے ۔ اس قسم کا دعویٰ سن کر پہلے تو دل گھبرانے لگتا ہے ۔ لیکن ذرا غور کرنے سے تسلی حاصل ہوتی ہے ۔

(۱) جو عرصہ واقعات اور اُن کے قلمبند ہونے کے درمیان گزرا اس میں لوگ بہت مبالغہ کرنے لگ جاتے ہیں ۔ دوسری پشت کا کبھی ایسا ذکر آیا ہے کہ گویا وہ یک لخت آپہنچی اور ایک ہی دن میں پہلی پشت کو معزول اور متروک کر دیا جیسے پہرہ کی چوکی دوسری چوکی کو بدل دیتی ہے یا جیسے دن کے بعد فوراً رات شروع ہو جاتی ہے ۔ بہت لوگ جنہوں نے یسوع کو یروشلم یا گلیل میں دیکھا ہوگا اُس صدی کے آخر

تک زندہ رہے ہونگے اور بہت لوگ ایسے بزرگ ہونگے کہ وہ انجیل نویسوں کے بیان میں کسی فسانہ یا خیالی قصہ کو دیکھکر فوراً بول اُٹھتے کہ یہ درست نہیں اور اگرچہ ہماری اناجیل کچھ عرصہ تک لکھی نہ گئیں لیکن جن چشموں سے وہ تیار ہوئیں وہ تو بہت عرصہ پہلے اُن میں مروج تھیں علاوہ ازیں عرصہ کی امتداد اور زمانہ کی درازی بہت وقعت نہیں رکھتی اگر واقعہ غیر ممکن الوقوع نہ ہو اور جس تاریخ میں اُس کا ذکر ہے اُس کے مطابق ہو۔ تو دُنیاوی تاریخ کا مورخ ایسی شہادت کو قبول کر لیتا ہے جو واقعہ سے بہت دیر بعد بھی حاصل ہوئی ہو۔ مثلاً اس بیان میں کہ لیڈی نیلسن کمرہ سے چلی گئی جب نیلسن نے پیاری لیڈی ہملٹن کا ذکر تعریف کے ساتھ کیا۔ مورخہ ماھن (Mahan) کہتا ہے کہ اگرچہ یہ واقعہ بہت دیر بعد احاطۂ تحریر میں آیا (پنتالیس سال کے بعد) تو بھی یہ اس قسم کا واقعہ ہے جو یادداشت میں نقش ہو جاتا ہے اور غالباً بحیثیت مجموعی اسی طرح واقعہ ہوا۔ اور ایک دوسرے واقعہ کے بارہ میں وہی مورخ لکھتا ہے "یہ خفیف واقعہ اگرچہ تقریباً ستر سال کے بعد پہلی دفعہ ظاہر ہوا تو بھی یہ اپنی شہادت آپ رکھتا ہے" اور آکسفورڈ کے پرنسپل ڈرمنڈ صاحب خوب تحریر فرماتے ہیں "اگر ہم یہ مان لیں کہ پہلی تین اناجیل مسیح کے بعد چالیس اور ساٹھ سال کے عرصہ کے درمیان لکھی گئیں تو بھی وہ قدیم مصالح پر مبنی تھیں اور یہ ناممکن نہیں کہ چالیس سال کے بعد بھی مسیح کے قول اُن کے دلوں میں ایسے ہی نقش ہوں جیسے کہ شروع میں تھے۔ میری یادداشت تو بہت عمدہ نہیں لیکن میں بہت قول سنا سکتا ہوں جو چالیس یا پچاس سال پہلے کہے گئے تھے اور بعض حالتوں میں تو وہ سارا نظارہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے"۔

(۲) ایک اور عام غلطی رواج پا گئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ چونکہ یہ اناجیل واقعات سے ایک پشت بعد لکھی گئیں اور تقریباً چالیس سال تک زبانی

روایتوں کے طور پر چلی آئیں اور راویوں کے ذریعہ سے کئی ایک تبدیلیاں وغیرہ بھی اس میں داخل ہو گئیں۔ لوقا اس غلطی کی تردید اپنی انجیل کے دیباچہ ہی میں کر دیتا ہے کہ کیسی احتیاط سے کام لیا گیا اور کیسے معتبر اشخاص کی شہادت پر واقعات قبول کئے گئے یہی ہم مرقس کی انجیل کے بارہ میں کہہ سکتے ہیں۔ اس میں عام روایت مندرج نہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آئی ہو۔ بلکہ پطرس کے وعظوں اور بیانات کا تذکرہ۔ الغرض یہ دعوےٰ جو بعض لوگ کرتے ہیں درست نہیں کہ چونکہ فلاں انجیل (فرض کرو) ۰ئہ تک لکھی نہ گئی تھی اس لئے اُس میں اُس زمانہ کی عام روایت اور بگڑی تاریخ مندرج ہے بلکہ برعکس اس کے ایسی عام غلطی کی اصلاح کے لئے یہ غالباً لکھی گئی ہو +

(۳) یاد رہے کہ کم سے کم ایک انجیل میں تو یہ صاف دعویٰ درج ہے کہ میں عینی گواہ کے ذریعہ لکھی گئی ہوں۔ تاریخی واقعات کی صحت دریافت کرنے میں عینی گواہ کی شہادت اور چشم دید واقعات کا بیان بہت ہی قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ موقعہ کا گواہ کچھ پریشان خاطر ہو جائے۔ جبکہ ملکی امور میں یا کسی بڑی لڑائی میں۔ یا کہ اسے کچھ تعصب ہو یا اُس کی یادداشت دھوکا دے جائے یا واقعات کے محض درج کرنے کے سوا اُس کی کچھ اور غرض ہو۔ پس گو موقعہ کا گواہ غلطی کر سکتا ہے تو بھی ظن ہمیشہ ان کا طرفدار رہے اور سب اس کے بیان کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں جب تک کہ وہ غلط ثابت نہ ہو۔ جس سوانح عمری کا ذکر پیشتر ہوا اُس سے میں ایک اور مثال پیش کرتا ہوں۔ مسٹر سنٹ جارج یعنی صدر اسقف ٹرینچ کی والدہ ماجدہ اپنے روزنامچہ میں تحریر کرتی ہیں۔ کہ ایک موقعہ پر میں نے نیلسن کو شراب کے نشہ میں دیکھا۔ اور اس تحریر پر نیلسن کا مورخ یہ رائے لگاتا ہے "خواہ کیسے ہی افسوس کی بات ہو ایسا وقوعہ اس قدر ناممکن نہیں کہ موقع کے گواہ کی شہادت کو توڑ ڈالے خاص نیلسن

جیسے شخص کے معاملہ میں بھی جو اپنی معتاد پرہیزگاری کے باعث مشہور تھا اور جو اُس کی صحت کے لئے نہایت ضرور تھا"۔

اب دیکھئے کہ ایک انجیل نویس صاف لکھتا ہے کہ یہ واقعات اُسکے قلم سے نکلے ہیں جس نے اُن کو دیکھا اور جن میں اُس نے خود حصہ لیا۔ چوتھی انجیل میں ایک خاص عجیب واقعہ کے بارہ میں موقعہ کے گواہ کی نہ صرف پختہ شہادت موجود ہے (یعنی مسیح مصلوب کی پسلی سے خون اور پانی کا نکلنا۔ جس نے یہ دیکھا ہے اس نے گواہی دی ہے۔ اور اُسکی گواہی سچی ہے) بلکہ ضمیمہ سے صاف پتا لگتا ہے کہ ساری انجیل کا لکھنے والا موقعہ کا گواہ تھا۔ "یہ وہی شاگرد ہے (جسے یسوع پیار کرتا تھا) جو ان باتوں کی گواہی دیتا ہے اور جس نے اُن کو لکھا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اسکی گواہی سچی ہے"۔ میں تو جراُت نہیں رکھتا کہ ایسی صاف گواہی کو ٹال دوں۔ آیا اس انجیل میں واقعات کی ترتیب ٹھیک ہے یا نہیں آیا مسیح کی تقریریں من وعن ویسی ہی درج ہوئیں جیسے کہ وہ سُنائی گئی تھیں۔ یا مابعد لوگوں نے مضمون میں کچھ تصرف کیا۔ یہ مقدم سوال نہیں مقدم سوال یہ ہے کہ جنھوں نے پہلے انجیل کو شایع کیا وہ جانتے تھے کہ یہ رسول یوحنا کی تصنیف ہے۔ اس کے بارہ میں کچھ شک نہیں۔ البتہ یہ تو ہم تحقیق طور پر نہیں بتا سکتے کہ کب اُس نے اسے لکھنا شروع کیا۔ اُس ضمیمہ کا یہ مقصد ہے کہ یوحنا رسول روایت مندرجہ انجیل کا نہ صرف چشمہ اور محافظ تھا بلکہ خود اُس نے اسے تحریر بھی کیا۔ پس جو اس صاف بیان کو ٹال دینا چاہتے ہیں۔ ہم ان کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہو سکتے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس انجیل میں جس مسیح کا ذکر ہے وہ متفرق مسیح ہے پہلی تینوں اناجیل کا مسیح نہیں۔ لیکن کلیسا جامع نے اس رائے کو بالکل رد کیا اور بتا دیا ہے کہ چاروں اناجیل سے ایک پوری تصویر مسیح کی نکلتی ہے۔ بعضوں نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اس انجیل کا مصنف کوئی

فلاسفر معلوم ہوتا ہے نہ کہ ایک مچھوا۔ کیا مچھلی پکڑنے والے کے سوا کوئی اور ہمیں یہ بتا سکتا تھا کہ ۱۵۳ مچھلیاں جال میں آئیں۔ ڈاکٹر ایبٹ صاحب بھی خیال کرتے ہیں کہ اس تعداد میں ایک مخفی اشارہ کلیسیا کی طرف ہے جو شریعت اور روح سے پیدا ہوئی۔ وغیرہ۔ کیا ڈاکٹر ایبٹ کسی مچھوے کو بتا سکتے ہیں جو اپنے جال کی مچھلیوں کو نہ گنتا ہو اور اگر بڑی تعداد مچھلیوں کی ہو تو زور سے اس کا بیان نہ کرے؟۔ کشتی والوں کے سوا ہمیں اور کون ان کشتیوں کی ترتیب بتا سکتا تھا۔ جو اس انجیل کے چھٹے باب میں مذکور ہے جبکہ ہمارے خداوند کے سامعین جھیل کے ایک کنارہ سے دوسرے پر منتقل ہو گئے۔ ایسے انتقال کے ذکر کرنے کا اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا سوائے اس کے مصنف واقعات کا بیان کیا چاہتا تھا نہ کہ دل سے ان کو گھڑنا چاہتا تھا۔

(۴) ہم نے مانا کہ واقعات کے وقوع ہونے اور ان کے قلمبند ہونے کے درمیان کچھ عرصہ گزرا۔ لیکن ہمیں یہ بھی ماننا چاہئیے کہ واقعات مندرجہ کیسے عجیب اور قابل یاد ہیں۔ سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ یسوع کی سیرت ایسی لاثانی اور موثر تھی کہ اس کے رفیق اگر پورے طور سے اُسکا بیان نہ کر سکتے تو بھی اُن کے دلوں میں اُسکی بعض خاص باتیں تو ضرور نقش ہو گئی ہوں گی۔ نیپولین کی زندگی کے بارہ میں اس کے جرنیلوں اور رشتہ داروں اور مصاحبوں نے مختلف بیان کئے ہیں۔ لیکن اُن سب سے اُس کی سیرت کا جو نقشہ کھینچا جاتا ہے وہ ایک ہی ہے۔ ہمارے خداوند کے بارہ میں اس کا ظن غالب تھا کہ ایک ناکامل نقشہ کھینچا جائے لیکن اس کا ظن نہ تھا کہ ایک غلط نقشہ کھینچا جائے۔ اور اس کی زندگی کے اکثر واقعات اور حالات کے بیان پر بھی یہی صادق آتا ہے۔ ایسے امور دلوں پر نقش کالحجر ہو جاتے ہیں۔ جس نے اُس مفلوج کو چھت میں سے نیچے لٹکایا جاتا اور اچھا ہوتا دیکھا کیا وہ اُس کو کبھی بھول سکتے تھے؟ اور جب مسیح

کی ساری زندگی ایسی عجیب اور اُس کی موت ایسی لاثانی اور موثر قسم کی تھی تو عام معمولی واقعات کی طرح اُس میں غلطی واقع ہونے کا چنداں گمان نہیں ہو سکتا۔

جیسا پیشتر ذکر ہوا کہ خاصکر ہم مسیح کی شخصیت اور اُس کے کام کو جاننا چاہتے اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور اس لئے اُس شخصیت کی اس موثر اور دل میں گھر کر لینے والی صفت کا خاص لحاظ کرنا چاہئے ڈاکٹر ایبٹ نے بہت کوشش کی کہ ٹامس ابیکٹ (Thomas. a. Becket) کی زندگی اور وفات کے بیانات کی طرح اناجیل کے بیانات کو بھی غیر معتبر ثابت کرے۔ اِس شخص کی زندگی کے بعض واقعات اس کی شہادت کے پانچ سال کے اندر لکھے گئے اور بہت سے معجزے جو اس کتاب میں درج ہوئے وہ وقوع ہونے کے عین بعد ہی احاطہ تحریر میں آئے۔ تو بھی کچھ شک نہیں کہ بقول ڈاکٹر ایبٹ "سخت جھوٹ" اُس میں داخل ہو گئے اور موقعہ کے گواہ بھی کبھی کبھی سخت غلطی میں پڑ جاتے ہیں اور ڈاکٹر پرسی گارڈنر (Dr Percy Gardner) اسی قسم کے ایک اور واقعہ کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ سنٹ فرانسس اوف آسیسی (St Francis of Assisi) کی وفات سے پچاس سال کے عرصہ میں اس کا قصہ بڑھنے اور بدلنے لگا اور عجیب عجیب کرامات اور معجزے اُس سے منسوب ہونے لگے جب سے فرانسِسکن سوسائٹی (Franciscan Society) کی قسمت کھل گئی۔

لیکن ان دلیلوں سے یہ ظاہر ہوتا کہ یہ قصے کیسے کمزور ہیں اور جو نقشہ اس آدمی کا لوگوں کے دلوں میں بیٹھا تھا جس کے گرد یہ قصے جمع ہو گئے اُس کو وہ دھندلا نہیں کر سکتے۔ باوجود اس قصہ و کہانی کے طومار کے بیکٹ اور فرانسس کی سیرتیں زیادہ نمودار اور درخشاں ہیں۔ تو کتنا زیادہ یسوع

کی زبردست اور موثر سیرت کا نتیجہ ہوگا۔ جو اثر اس سیرت کا یسوع کے رفیقوں پر ہوا وہ لاثانی تھا اور ایسے اثر کو امتداد زمانہ ضایع نہیں کرسکتا اور یہ اثر نہ ایک دو پر بلکہ بہتوں پر ہوا تھا ✣

ایسے معاملہ میں ہم اُن لوگوں کی سیرت اور حالات کو بھی مدنظر رکھیں جن پر یہ اثر ہوا۔ یہودی صدر مجلس کے ممبروں کی طرح آج تک بھی بعض یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ وہ جاہل اور ان پڑھ لوگ تھے لیکن اسی وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ تھے اُنکے دلوں پر ایک خالص اور بے طرفدارانہ نقشہ جم سکتا تھا۔ کیونکہ جن لوگوں کی رائے پک چکی ہیں اور جو پہلے سے تصور باندھ چکے ہیں ان پر ایسا نقشہ جمنا ناممکن یا کم سے کم بہت محال تھا۔ وہ مثل شیر خوار بچوں کے تھے جن کے سادہ کورے دلوں پر یسوع اپنی تاثیر کو نقش کرسکتا تھا ✣

جیسا ایک فصیح مصنف نے کہا ہے "جو لوگ غل غپاڑہ میں زندگی بسر کرتے ہیں اُن کے دلوں میں نقشہ پر نقشہ جمتا جاتا ہے اور آخر کار سب خلط ملط اور بے معنی ہوجاتا ہے۔ لیکن کسانوں کی زندگی میں تاثیریں ایسی کم ہوتی ہیں کہ وہ صفائی سے یاد رہ سکتی ہیں۔ جن لوگوں کو مسیح سے زیادہ واسطہ پڑا وہ اس قسم کے تھے۔ ان کی زندگی میں جو پہلا موثر موقعہ تھا وہ اُس وقت تھا جب مسیح پہلی دفعہ اُن سے متکلم ہوا۔ اور اکثر صورتوں میں مسیح کے ساتھ اُنکی ملاقات کے وقت کچھ نہ کچھ عجیب موثر واقعہ ہوا تھا جسے وہ بھول نہ سکتے تھے۔ مثلاً والدین میں سے کسی کی موت کا اندیشہ۔ کسی دوست کا بیماری میں سے بحال ہونا۔ کسی دیوزدہ بچے کا ہوش میں آنا۔ . . . . . یہ عجائبات ان اشخاص کی زندگی پر دن بھر یا رات بھر جھومتے رہے ان کے دل اور تصوّر کو عجب حرکت دی گئی تو پھر کس طرح وہ ان کو بھول سکتے تھے ✣

دوم۔ چونکہ مشہور اور بہادر لوگوں کی زندگی میں عجیب عجیب قصے کہانیاں ملادی جاتی ہیں اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید اناجیل میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہو۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ یسوع کی زندگی کے بیانات میں وہ سب حیرت انگیز صفات اور حالات ملادے گئے جو عہد عتیق میں مشہور لوگوں سے منسوب تھے اور جن باتوں کا ذکر نبیوں نے آنے والے مسیح کے بارہ میں کیا تھا وہ سب سمجھ لیا گیا کہ یسوع میں پورا ہو گیا ہے۔ چونکہ یسوع مسیح تھا اس لئے ضرور وہ ساری باتیں اُس میں ظاہر ہوئی ہونگی۔ چنانچہ ڈاکٹر پرسی کاڈنر اپنی کتاب میں بیان کرتے ہیں کہ "جب پہلے مشنری یہودیہ کے شہروں میں منادی کرنے گئے تو یسوع کے مسیح ہونے کے دعوے پر جو عام اعتراض اُن پر کئے گئے ہونگے وہ اس قسم کے ہونگے۔ کہ ان کے اُستاد کی زندگی۔ اس کی پیدائش اور اس کی موت نبیوں کی پیشین گوئیوں کے مطابق نہیں۔ کیسے ہو سکتا تھا کہ مسیح گلیل میں پیدا ہو۔ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ داؤد کے خاندان سے نہ ہو۔ چاہیئے تھا کہ وہ یسعیاہ نبی کی مانند اپنے الزام لگانے والوں کے آگے بے زبان ہو۔ چاہیئے کہ وہ اُس بادشاہ کی طرح جس کا ذکر زکریاہ نبی کی کتاب میں ہے گدھے پر سوار ہو کر آئے۔ اُس کے کپڑوں کا اُتارا جانا اور اُس کے دشمنوں کے درمیان بانٹا جانا ضرور تھا جیسا کہ ۲۲ مزمور میں لکھا ہے۔ چاہیئے تھا کہ اُس کی قبر دولتمندوں کے ساتھ ہو وغیرہ۔ ایسے اعتراضات کے جواب دینے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے کہ ہم کہیں "بیشک۔ ہمارے خداوند کا یہی حال تھا" پس بہت قصے خواہ کسی طرح سے وہ برپا ہوں جن میں یہ خوبی تھی کہ وہ ہمارے خداوند یسوع کی زندگی کو پیشین گوئی کے مطابق بنائیں اُن میں یہ طبعی میلان تھا کہ وہ زمانہ کے ہاتھ سے معدوم نہ ہو جاتے۔ اور جو ان کو ان تاریخوں میں جگہ دیتے جنہیں سوسائٹی نے قبول کیا تھا۔

اب اس اعتراض پر ہم غور کریں۔ اس پر تو شک نہیں کیا جاتا کہ یسوع

روحانی شان و شوکت کا مسیح تھا جس کی تصویر عہد عتیق کے منتشر اشاروں سے کہیں اعلےٰ تھی اگر کسی انجیل نویس پر یہ اعتراض کیا جاتا کہ یسوع عہد عتیق کی تصویر کے مطابق نہیں اور اگر وہ اس آزمائش میں پڑکر اس اُمید کے مطابق اُس کو بنانا چاہتا تو وہ صرف چند خفیف بیرونی امور میں کر سکتا تھا ۔

اور یہ بھی مخفی نہ رہے کہ اس قسم کی جھوٹی ساخت پرداخت یہودیوں کے سامنے منادی کرنے ہی میں پیدا ہو سکتی تھی خاص کر جنہوں نے مسیحی پیشین گوئیوں کا مطالعہ کیا تھا ۔ سب جانتے ہیں کہ ان کی کیسی مختصر تفسیریں کی جاتی تھیں ۔غیر قوم کلیسیا پہلے پہلے ان باتوں میں کچھ مذاق نہ رکھتی تھی ۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی یہودی ایسا سوال کرے یا شاید کسی نے ایسا سوال کیا کیونکہ یہ ضرور تھا کہ یسوع اور مسیح کے بارہ میں پیشین گوئیوں کے درمیان مطابقت ہو لیکن انجیل نویس کا ایسی غلطی میں پڑنا جو معترض اور مجیب دونوں کو بخوبی معلوم ہو ایسا قابل اعتبار نہیں ۔ مثلاً ہم وہی مثال لیں جو ڈاکٹر گارڈنر نے پیش کی ہے ۔یعنی یسوع کا مسیح کے خاندان سے پیدا ہونا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ خاص بات تھی مسیح کے بارہ میں "کیا کتاب مقدس نہیں کہتی کہ مسیح داؤد کی نسل سے اور بیت لحم کے شہر سے آتا ہے جہاں کا داؤد تھا" اور انجیل نویس نے اس تقاضا کو پورا کیا لیکن کس طرح سے ؟ نہ محض دعوے کے ذریعے کہ ایسا تھا بلکہ نسب نامہ کو درج کرنے کے ذریعے ۔ تاکہ اگر کسی کو شک ہو تو تحقیق کرلے کیونکہ یہودی نسب نامے بخوبی پرکھے جاسکتے تھے ۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ کوئی شہادت ہم تک نہیں پہنچی جس سے ثابت ہو کہ پہلے شاگرد عموماً ایسے امور کی نسبت بڑی فکر کرتے تھے پولوس جیسا شخص شاید ایسی مطابقتوں سے کوئی دلیل پیدا کرے ۔ لیکن وہ بھی اپنے ایمان کا دارو مدار زیادہ اصولی اور بنیادی باتوں پر رکھتا ہے اور یوحنا نے جو پہلے شاگردوں کے اُس کا ذکر کیا ہے جو وہ یسوع سے رکھتے تھے اگر اُس کو معتبر سمجھیں تو ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ ایسی باتوں پر بہت کم

زور دیتے تھے۔ معترض کہتا ہے کہ "کیا کوئی اچھی چیز ناصرت سے نکل سکتی ہے"۔ جواب یہ ملتا ہے کہ "آکر دیکھ لے"۔ نہ ڈاکٹر گارڈنر کی طرح یہ جواب دیا جاتا ہے کہ "اس کا تعلق ناصرت سے نہیں بلکہ بیت لحم سے ہے"۔

(۳) شاید کوئی خیال کرے کہ انجیل نویسوں کی اپنی رائیوں نے انکے بیانات پر بہت کچھ رنگ چڑھایا۔ جس زمانہ میں کہ اناجیل قلمبند ہوئیں کئی مشکل سوال کلیسیا میں پیدا ہو گئے تھے اور بعض ایک کی تائید کرتے اور بعض دوسرے کی۔ بعض مسیح کے اقوال کو اپنی رائے کی تائید میں پیش کرتے اور بعض اُن سے بالکل متفرق معنی نکالتے اور یہ بشریت کا خاصہ نہیں کہ کوئی مصنّف جو کسی امر کے بارہ میں پختہ رائے رکھتا ہو اور وہ انجیل لکھنے بیٹھے اور اپنے تئیں ظاہر نہ کرے کہ وہ کس فریق سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ ہولٹ زمن (Holtzmann) صاحب نے یہ صاف طور سے کہہ دیا "کوئی انجیل نویس ہیروڈوٹس کی طرح تاریخ نہیں لکھتا کہ جو کچھ اُس نے سُنا ہے محض اُس کا بیان کردے وہ سب کم و بیش کسی مذہبی رائے کے مقلّد ہیں"۔ شخصی خاصیت تحقیق ہوسکتی ہے جیسا کہ آلیور وِنڈل ہالمس صاحب نے اپنے طور پر یہ لکھا ہے کہ "سمتھ تم کو سمتھی سچائی بتاتا ہے اور براؤن براؤنی حقیقت ظاہر کرتا ہے"۔

مگر اس مشکل پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ آجکل یہ اعتراض اُٹھ گیا ہے بلکہ اس کے خلاف رائے پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ شمیڈل (Schmiedel) صاحب نے بھی اتنا مان لیا ہے کہ "بحیثیت مجموعی ایسا میلان طبع اناجیل کے صرف چند ہی حصّوں میں آشکارا ہوتا ہے"۔ انجیل نویسوں نے اپنے مختلف مقاصد کے مطابق مضامین کا انتخاب کیا۔ مثلاً متی نے بعض امور کو نظرانداز کیا جس کا دوسری انجیلوں نے مفصّل بیان کیا ہے۔ کیونکہ متی کا عام مقصد یہی ہے کہ مسیح کے اقوال کو دریافت کرکے قلمبند کرے۔ مصنّف کے مزاج تعلیم اور مقصد کا بڑا اثر طرز تحریر پر پڑتا ہے۔ اور اس قسم کا امتیاز

اناجیل میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کا کبھی گمان بھی نہیں گزرا کہ مصنّف کی غرض یا کسی یک طرفہ رائے نے اس کی تحریر پر اثر ڈالا ہو۔

(۴) بعض سمجھتے ہیں کہ جب کسی واقعہ کے بیان میں انجیل نویسوں کا اختلاف ہے تو ان دونوں کا اعتبار گھٹ جاتا ہے چنانچہ شمیڈل صاحب نے "قیامت" پر جو مضمون انسائکلوپیڈیا ببلکا (Encyclopedia Biblica) میں دیا ہے اُس میں اسی اعتراض پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اس اعتراض کے بارہ میں پیلی صاحب کا جواب درج کرنا کافی معلوم ہوتا ہے۔ پیلی صاحب لکھتے ہیں کہ "میں اس سے زیادہ اور جلدباز اور نامعقول فہم سے واقف نہیں جو کسی قصّہ کے بیان کو محض اس بنا پر رد کرے کہ جن ماجروں کا اس سے تعلق ہے ان کا مختلف طور پر بیان ہوا ہے۔ انسانی شہادت کی معمولی کیفیت اصلی سچائی ہے جو ماجروں کے اختلاف میں ظاہر ہے۔ عدالتوں میں یہ روزمرّہ کا تجربہ ہے۔ وکیل اس قسم کے اختلافات پر بہت زور دیا کرتے ہیں لیکن اکثر ان سے ججوں پر بہت اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ برعکس اسکے شہادتوں میں لفظی اور تفصیلی مطابقت سازش اور فریب کا شک پیدا کرتی ہے اور جب تحریری تاریخیں اسی قسم کا بیان کرتی ہیں تو اسی قسم کا خیال انکی نسبت پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات تاریخوں میں تفصیل کے متعلق بہت اختلاف ہوتا ہے بلکہ بیانات نقیض معلوم ہوتے ہیں لیکن اس سے عام اعتبار واقعہ کا جاتا نہیں رہتا۔ مثلاً یہودیوں نے جو ایلچی کلودیوس کے حکم کے خلاف کہ ہیکل میں بُت نصب کیا جائے روم کو بھیجا اُسکی نسبت فائلو کہتا ہے کہ وہ فصل کے موسم میں بھیجا گیا۔ حالانکہ یوسیفس کہتا ہے کہ وہ بیج بونے کے وقت بھیجا گیا حالانکہ دونوں ہمعصر مصنّف ہیں۔ اور کسی تاریخ پڑھنے والے کو اُس قاصد کے بھیجے جانے کے بارے میں شک نہیں ہوتا۔ انگریزی تاریخ ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ مثلاً مارکوئس آف آرگل کی وفات جو چارلس دوم کے زمانہ میں ہوئی اُسکی نسبت بہت اختلاف

ہے۔ لارڈ کلیر نڈن کا بیان ہے کہ ان کو پھانسی کا حکم ہوا اور اُسی دن اُس حکم کی تعمیل بھی ہوگئی۔ لیکن برعکس اس کے برنٹ وغیرہ دیگر مورخ لکھتے ہیں کہ سینیچر کو اُس پر فتوے ہوا اور اتوار کو اُس کی تعمیل ہوئی کیا کوئی شخص اس سے یہ نتیجہ نکالیگا کہ مارکوئس اوف آرگل کو پھانسی نہیں ہوئی۔ پھر اناجیل میں ایسے تفصیلی اختلافات کے باعث عام بیان کی تردید نہیں ہوسکتی +

علاوہ ازیں اناجیل کے بیانات کے معتبر ہونے کے بارہ میں کئی مزید شہادتیں ہیں جن کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے +

(۱) یسوع کے اقوال بڑی صحت سے محفوظ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض زمانہ کی دستبرد سے بذات خود محفوظ تھے اور فراموش نہ ہو سکتے تھے۔ البتہ جن تعلقات میں وہ کہے گئے تھے اُن سے وہ جُدا ہوگئے ہوں تو ہوگئے ہوں لیکن وہ خود محفوظ رہے۔ سٹراس (Strauss) خود یہ کہتا ہے کہ" یسوع کے موزوں اور معقول اقوال زبانی روایت کے طوفان میں غرق نہیں ہو سکتے تھے البتہ وہ اپنے اصلی تعلقات سے بعض اوقات جدا ہوگئے اور مشابہ سیلاب زمانہ نے چٹان کے ٹکڑوں کی طرح ان کو وہاں جا لگایا جس سے وہ فی الحقیقت تعلق نہ رکھتے تھے"۔ یہی وجہ تھی کہ بعض انجیل نویسوں نے ان اقوال کو اکٹھا جمع کر دیا جو ان کے مطلب کے موافق تھے۔ بلالحاظ اس کے کہ وہ کس قرینے میں استعمال ہوتے تھے۔ چنانچہ متی کی انجیل میں ایسے اقوال کا مجموعہ ہے جو مختلف موقعوں پر خداوند یسوع کی زبان سے نکلے تھے +

تمثیلوں کو پڑھتے وقت کوئی یہ نہ کہیگا کہ وہ من وعن صحت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ ان کا طرز بیان اور طریقہ سب یہ شہادت دیتے ہیں کہ ان میں کسی طرح کی ملاوٹ یا تحریف نہیں ہوئی۔ کیسے وہ ایسی حالت میں محفوظ رہیں یہ ایک معمّا ہے لیکن محفوظ تو رہی ہیں۔ البتہ ڈاکٹر پرسی گارڈنر یہ کہتا ہے کہ" یسوع کے کوئی اقوال ایسے نہیں جو بالکل احاطہ اعتراض

سے خارج ہوں"۔ اس کی طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "شیکسپیئر کا کوئی ڈراما احاطہ اعتراض سے خارج نہیں"۔ کیونکہ بعض دیوانہ عالم کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ وہ بیکن کی تصنیف ہیں ٭

(۲) ایک عجیب شہادت یہ ملتی ہے کہ انجیل نویسوں نے خداوند یسوع کے وہ نام اور لقب استعمال کئے جو دوسری صدی میں متروک ہو چکے تھے اس صدی میں یسوع نام کی بجائے مسیح کا لقب مروّج ہو گیا تھا۔ مسیح اس کا نام ہو گیا جبکہ وہ عہدہ تھا۔ لیکن اناجیل میں وہ نام یسوع استعمال ہوتا ہے اسی طرح "ابن آدم" کا لقب دوسری صدی میں غیر مستعمل تھا۔ لیکن انجیل نویس برابر اسے یسوع کی زبان سے صادر ہوا محفوظ رکھتے ہیں اور ایسی ہی اور بہت مثالیں پیش کر سکتے ہیں ٭

(۳) انجیلی بیان کی صحت کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ اس میں صاف دلی سے بارہ رسولوں کی کمزوریوں اور قصوروں کا اقرار ہے۔ مثلاً تمثیلوں کے معنی سمجھنے میں شاگردوں کا قاصر رہنا اور نازک موقعوں پر انکے ایمان کی کمزوری۔ ان کے خیالوں میں دنیاداری۔ ایک دوسرے کے ساتھ انکا تکرار کرنا۔ اپنے خداوند کو صلیب کے وقت چھوڑ جانا۔ یہ سب صاف صاف بیان ہوا ہے۔ کچھ چھپا نہیں رکھا۔ اور کسی امر کو ٹالا نہیں اور نہ کسی امر کا بہانہ کیا ہے۔ جیسے کچھ واقع ہوا ویسے انہوں نے درج کر دیا بلا لحاظ اس کے کہ اس سے ان پر حرف آئیگا یا نہیں۔ چنانچہ پروفیسر فشر صاحب اپنی ایک کتاب میں اس دلیل کی یوں تشریح کرتا ہے "کسی قصہ کی صحت کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ آدمی اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا اور انپر جو زجر و توبیخ ہوئی اس کا صاف صاف اقرار اور بیان کرے۔ جب بوسول (Boswell) لکھتا ہے کہ جانسن نے اسے گھرکی کی نظر سے دیکھکر کہا "جناب میں تمہاری نسبت ڈیوڈ گارک کو زیادہ عرصہ سے جانتا ہوں اور تمہارا کوئی حق نہیں کہ اس کے بارے میں مجھ سے کچھ کہو"۔ یا جب

کوئی مصنف کہتا ہے کہ اُسے یہ کہا گیا " جناب اپنے دل کو کینہ سے پاک کرو تو کوئی شک نہیں کر سکتا کہ مصنف صحیح قصہ بیان کر رہا ہے۔ کیونکہ کوئی شخص اپنی ہتک کے لئے کوئی کتاب نہیں لکھتا اور جب کبھی کوئی مصنف ایسا کرتا ہے تو ظن اُسکی عام صحت کا پیدا ہوتا ہے" ۞

یسوع کی جو تصویر انجیل نے کھینچی ہے اس کی صداقت کی بیرونی مضبوط شہادت پولوس کے خطوط ہیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ اُس نے ان اناجیل میں سے کسی کو اپنے اس عقیدہ قائم کرنے سے پیشتر نہ دیکھا تھا۔ لیکن جو نقشہ مسیح کا پولوس نے کھینچا ہے وہ وہی ہے جو اناجیل میں ملتا ہے۔ وہی شخص ان میں مسیح مانا گیا ہے۔ وہی انسانی سیرت کا کمال یہاں نظر آتا ہے۔ اُسکی اُلوہیت کا ویسا ہی اقرار سب جگہ پایا جاتا ہے۔ اُس کی موت اور قیامت کا ذکر برابر وہی ہے۔ اگر پولوس اناجیل کے وسیلے مسیح کو جانتا تو نہ معلوم کس قسم کی تبدیلی اُسکے بیان میں ہوتی۔ وہ حقیقی مسیح جو اُس پر ظاہر ہوا جسے اُس نے اپنے تجربہ سے پہچانا اور جس کا حال اُس نے اُن سے سُنا جو خداوند مسیح سے واقف تھے وہ کسی امر میں اس مسیح سے متفرق نہیں جس کا ذکر اناجیل میں آیا ہے۔ الغرض جس مسیح کا ذکر اناجیل میں ہے وہ وہی مسیح ہے جس پر پہلے شاگرد ایمان لائے اور جسے وہ اپنا خداوند مانتے تھے اور اسی بنیاد پر کلیسیا قائم ہوئی۔ یہ تصویر مسیح کی ایسی نہیں جسے مابعد پشتوں کے مصوروں نے رنگ چڑھایا ہو ۞

ہم نے مانا کہ بعض معترضین اناجیل کے بیانات کو ہر امر میں صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ کسی ایسی کسوٹی کی تلاش کرتے ہیں جس پر لگانے سے ہر میل کچیل دُور ہو جائے اور اصل حقیقت باقی رہ جائے۔ یہ امر نہ صرف اقوال مسیح پر بلکہ سب ماجروں پر صادق آتا ہے جن کا ذکر اناجیل میں آیا ہے۔ جہاں پہلی تین اناجیل مسیح کے کسی قول کو مختلف طور سے بیان کرتی ہیں وہاں اکثر فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اُس قول کی اصلی صورت کیا تھی ۞

پس وہ کسوٹی کیا ہے؟ چنانچہ شمیڈل صاحب نے ان سائکلوپیڈیا ببلکا میں ایسی ٹی کا ذکر کیا ہے جسکے ذریعے اُس کی رائے میں معتبر کو غیر معتبر سے امتیاز کر سکتے ہیں۔ اور اس کسوٹی کا اس طرح سے ذکر کیا ہے۔ جب کوئی دُنیوی مورخ کسی تاریخی نسخے کو دیکھتا ہے جس میں کسی ایسے شخص کی تعظیم کا ذکر ہے جس کا پتا اور کسی جگہ سے نہیں ملتا تو وہ اُس بیان کے اُن امور پر خاص زور دیتا ہے جو محض اسکی عبادت سے منتج نہیں ہوتے اور وہ محض اس سادہ اور کافی دلیل کے زور پر یہ کرتا ہے کہ وہ اس بیان میں مذکور نہ ہوتے اگر مصنف ان کو ایک مسلمہ حدیث تسلیم نہ کرتا۔ اگر ہم کو ایسے امور ملیں۔ خواہ وہ تھوڑے ہی کیوں نہ ہوں وہ نہ صرف اپنی صداقت کو قائم کرینگے بلکہ بہت کچھ زیادہ۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہم ان ساری باتوں کو قابل اعتبار مان سکتے ہیں جو سیرت میں ان سے مطابق ہیں اور کسی وجہ سے شک کے قابل نہیں۔ اور فی الحقیقت بے طرفدار مورخ اسے اپنا فرض منصبی سمجھیگا کہ وہ دریافت کرے کہ کن وجوہات سے یسوع کے شاگرد اُسے ایسی تعظیم دینے لگے اور وہ ان دو باتوں کو صحیح تسلیم کریگا اول کہ یسوع عوام الناس پر رحم کیا کرتا تھا اور کہ وہ قدرت کے ساتھ وعظ کرتا تھا اور نہ فقیہوں کی طرح"۔ اس کسوٹی سے جو خفیف نتائج نکلے اس سے اسکی ازسرنو تحقیق کی ضرورت پڑتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شمیڈل صاحب بخوف زہرخوری کے اپنے تئیں فاقہ مارتا ہے۔ وہ غسل کے میلے پانی کے ساتھ بچہ کو بھی پھینک دیتا ہے۔ وہ مسیحی کلیسیا کے بانی کو محض ایک مہربان شخص اور ایک اچھا واعظ قرار دیتا ہے ✣

یہ نتائج نہ صرف اس کسوٹی پر شک ڈالتے ہیں بلکہ اس کا نقص صاف طور سے ظاہر کر دیتے ہیں۔ کسی بیان میں ان سارے امور کو بالائے رکھنا جو شخص ممدوح کی عبادت سے صادر ہوتے ہیں یہ معنی رکھتا ہے کہ جو کچھ اُس بیان میں ضروری ہے اُس سب کو برطرف کریں اور بسم اللہ ہی غلط ہوگی۔ یہ اصول کسی دیگر ممدوح شخص کے تذکرہ پر چسپاں کریں۔ نیلسن کی وفات کے وقت قوم نے یہ گیت گایا:

"اُس کا بدن چین سے آرام کرتا ہے لیکن اُس کا نام ابد الآباد زندہ رہے"۔
اب اس امر کے دریافت کرنے کے لئے کہ کیوں اُس کا نام ایسا زندہ رہتا ہے میری رائے میں شمیڈل یہ کہیگا کہ نیلسن متکبر شخص تھا اور بہت خوشامد پسند اور لیڈی ہملٹن کی تعریفوں نے اُس کا دماغ خراب کردیا اور جب وہ سمندر پر جاتا تو ہمیشہ بیمار ہوجاتا تھا۔ اگر یہ حال ہو تو نیلسن نے جو مصر کے دریائے نیل اور ٹرافلگر پر مارے ان کا کیا ٹھکانا۔ پس ہیں ان واقعات سے شروع کرنا چاہیئے جس کے باعث اُس کی یہ تعظیم ہونے لگی۔

پس اناجیل کے پرکھنے کے لئے یہیں سے شروع کرنا چاہیئے اور ان کے اعتبار کا یہی حقیقی معیار ہے۔ اُنہیں سے مسیحی کلیسیا کی ہستی کی تشریح ہوسکتی ہے۔ یہ کنجی اس قفل کو ٹھیک لگتی ہے۔ کیا اناجیل ہمارے سامنے ایک مستند شخص کا ذکر کرتی ہیں جو خدا کو ہم پر منکشف کرتا ہے؟ یہ اسی واقعہ پر مبنی ہے کہ یسوع نے مسیح ہونے کا دعوے کیا کہ میں زمین پر خدا کا وکیل ہوں اور اپنے دعوے کی تصدیق اپنی زندگی موت اور قیامت کے ذریعے کی کہ میں خدا کے مکاشفہ کا مستند وسیلہ ہوں۔ اس واقعہ کے ذریعے کلیسیا کی تشریح ہوتی ہے۔ مسیح کی یہی تصویر اناجیل پیش کرتی ہیں جو کچھ اس دعوے کے مطابق اور مناسب ہے وہی قابل اعتبار ہے۔ کسی عینی گواہ کی شہادت اُس وقت قبول کی جاتی ہے جب وہ کسی قابل اعتبار واقعہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور ایسے گواہ کی شہادت جو واقعہ سے نصف صدی کے بعد گزرا اُسی صورت میں معتبر سمجھی جائیگی اگر وہ واقعہ جس کا وہ بیان کرتا ہے باقی معلوم شدہ واقعات کے مطابق ہو۔ پس شہادت کا معیار قابل اعتبار ہونا ہے اور قابل اعتبار ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ واقعہ اُس کے متعلق معلوم شدہ واقعات کے مطابق ہو۔ بعض باتیں ہیں کہ اگر وہ ایک شخص کے بارہ میں بیان ہوں تو اُن پر کوئی شک نہیں کریگا لیکن اگر دوسرے شخص کے بارہ میں وہی بیان

ہنوں تو ان پر شک کیا جائیگا۔ اور یسوع نے جو دعوےٰ کیا کہ میں مسیح ہوں اور اُس کے شاگردوں اور کلیسیا نے ایسا ہی اُسے مان لیا یہی وہ کسوٹی ہے جسکے ذریعے اناجیل کو پرکھنا چاہیئے۔ یہی اصل واقعہ ہے جس کے ذریعہ سے ہم اُسکے معجزوں اور قیامت کے بیان کو ماننے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اگر یسوع زمین پر خدا کا وکیل تھا اور اگر وہ اس کی خود تصدیق کرتا ہے تو ہم بے نظیر واقعات کو بھی مان سکینگے جو کہ معمولی انسانی تجربہ سے باہر ہوں۔ اُس کے خاص خاص ظہوروں پر کوئی شک ڈالے تو ڈالے لیکن اُس کے مسیح ہونے کی دلیل پر اُس کی زندگی کے عام واقعات پر جو اناجیل میں مندرج ہیں یقین لا سکتے ہیں۔ اس شخص مسیح کے بارہ میں یہ باتیں مان سکتے ہیں اور کسی کے بارہ میں نہیں ؂

اب رہا یہ سوال کہ ان اناجیل میں ایک قابل اعتبار مسیح ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے؟ جو تصویر انہوں نے پیش کی ہے کیا وہ مسیح کی سچی تصویر ہے؟ لاکلام ضروری امور میں یہ ایسا ہی ہے۔ اناجیل میں پیش کردہ تصویر خود اس کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ خدا کا وکیل ہے۔ اُس میں ایسے مکاشفہ کا ذکر ہے جو باقی سب مکاشفوں سے اعلےٰ ہے۔ یا یہ کہو کہ خدا جسم میں ظاہر ہے ؂

شاید پھر بھی کوئی یہ کہے کہ یہ تصویر شاگردوں کی ساخت ہے۔ اس اعتراض کو ہلمن صاحب نے بخوبی اُڑایا ہے۔ اور شاید کوئی کہے کہ کلیسیا نے یہ نقشہ کھینچا اور مسیح کو خلق کیا یا مسیح نے کلیسیا کو خلق کیا۔ یہ تصویر مسیح کی یہودیوں کے مروجہ خیالات کے بالکل برعکس تھی۔ یہاں تک کہ یوحنا بپتسمہ بھی اس کی نسبت غلطی کھانے کو تھا۔ جب یہ حال ہو تو چند بے علم شخصوں کی کیا حیثیت کہ ایسی تصویر کھینچتے۔ یہاں سٹوارٹ مل سے اقتباس کرنا کافی ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ "یہ کہنا فضول ہے کہ جس مسیح کا اناجیل میں ذکر ہے وہ تاریخی نہیں۔ اُس کے شاگردوں اور مریدوں میں سے کون ایسا

شخص تھا جو اُن اقوال کو پیدا کر سکتا جو مسیح سے منسوب ہیں یا اُس زندگی یا سیرت کو منکشف کرے جس کا ذکر اناجیل میں ہے ÷

مشہور اشخاص کے خواص عوام الناس سمجھ سکتے ہیں گو ان کی پیدائش وغیرہ کا ٹھیک حال ان کو معلوم نہ ہو۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ کلائیو نے ہندوستان میں سرکار انگریزی کی حکومت کی بنیاد ڈالی اور ولنگٹن نے نپولین کی طاقت کو توڑ ڈالا۔ اور واٹ (watt) نے دُخانی انجن کو تکمیل دی اور یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ یسوع وہی المسیح تھا۔ حکام کا اُس کو صلیب دینا اُس کے اس دعوے کا ثبوت ہے۔ اس کی تفصیل کہ کن وسائل سے اُس نے یہ دعوے ثابت کیا مختلف شخصوں کو مختلف طور سے سمجھ میں آئی۔ لیکن اس میں کوئی تعجب خیز امر نہ تھا ÷

پس ہم اس سب سے کیا نتیجہ نکالیں۔ اناجیل کی نسبت یہ کہنا ممکن نہیں کہ "ہر ایک بات جس کا ان میں ذکر ہے وہ ٹھیک ٹھیک ایسی ہی واقع ہوئی جیسا ذکر ہے" اس کی ایک کافی دلیل یہ ہے کہ خود انجیل نویسوں نے بعض واقعہ کو مختلف طور سے پیش کیا ہے بعض واقعات مثلاً مسیح کا بے باپ پیدا ہونا وغیرہ پر ایمان لانا بہت کچھ ماقبل خیالات پر موقوف ہے اور اگر کوئی ان کا قطعی ثبوت طلب کرے تو مشکل ہے۔ اسی طرح گدرینیوں کے دیوانہ کے واقعہ میں یا تو کوئی غلط فہمی ہے یا کوئی بات ایسی چھوٹ گئی ہے جس کے بغیر بیانات کو تطبیق دینا مشکل ہے۔ لیکن اس سے واقعہ پر شک نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک ہمارا ایمان مسیح پر ہے اُس میں کچھ نقص پیدا نہیں ہوتا کہ آیا اُس نے یریحو میں ایک اندھے کو اچھا کیا یا دو کو آیا اُس نے شہر میں داخل ہوتے ہوئے اچھا کیا یا شہر سے نکلتے ہوئے ہم اناجیل میں کس امر کی تلاش کرتے ہیں؟ مسیح کے علم کی تلاش۔ اُس کی پہچان کی تلاش۔ اناجیل میں مسیح کی زندگی کا خاکہ کھینچا ہے اور اُس کے اقوال کو صحیح طور پر درج کیا ہے جس سے ہم اُس کی تعلیم کا ٹھیک اندازہ

لگا سکتے ہیں۔ یہ اناجیل کا مسیح ہے جس نے لاکھوں کروڑوں کا دل فریفتہ کیا اور خدا کا جلال ظاہر کرنے کا وسیلہ بنے اور اس سے ایک شمّہ بھر بھی ہمارے دل ان عالموں کی نکتہ چینیوں کے ذریعے پھٹ نہیں سکتے۔ ایسی نکتہ چینی کا خطرہ یہ ہے کہ لوگوں کا دل خاص بڑے واقعات سے ہٹا کر تفصیل کی طرف رجوع کر دے۔ امی ایل (Amiel) نے جو آگاہی دی وہ یہاں بھی صادق آتی ہے " یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ سچائی کے ذریعے سچّائی کا خون کریں۔ اس بہانہ سے کہ اس کا ہم زیادہ تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا چاہتے ہیں ہم تصویر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں یہ ایسی بیہودگی ہے جسکے ہم اپنے علمی گھمنڈ میں اکثر مرتکب ہوتے ہیں ؂

ساتواں باب
اناجیل میں معجزوں کا ذکر

یسوع مسیح کے افعال اور اقوال سے ظاہر ہے کہ شفائے امراض اُسکے کام کا نہ صرف ضروری بلکہ حقیقی جُز تھا۔ اور انجیل نویس بار بار یسوع کے کاموں کو دیکھکر یہ اقرار کرتے ہیں کہ اُنھوں نے ہر ایک شفا کے معجزے کو درج نہیں کیا اور وہ اکثر ایسے مجمل بیان پر اکتفا کرتے ہیں جیسے لوقا ۴: ۴۰ میں مذکور ہے " اور سورج کے ڈوبتے وقت وہ سب لوگ جن کے ہاں طرح طرح کی بیماریوں کے مریض تھے انہیں اُس کے پاس لائے اور اُس نے اُن میں سے ہر ایک پر ہاتھ رکھکر اُنہیں اچھا کیا"۔ جسمانی شفا کے واقعات سے جو ایسے نمودار ہیں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں مسیحائی عہدہ اسی شفائے امراض پر محدود نہ سمجھا جائے۔ تو بھی اُسے کئی بار مجبوراً اپنے ان کاموں کی طرف لوگوں کو توجّہ دلانا پڑا اور اُس نے جتایا کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ جب لوگوں نے ہیرودیس کی دھمکی کا ذکر یسوع سے کیا تو اُسکے جواب سے تقریباً ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ گویا اُسکا

کل کام یہی ہے ۔" دیکھ میں آج اور کل بد روحوں کو نکالتا اور شفا بخشنے کا کام انجام دیتا رہونگا اور تیسرے دن کمال کو پہنچونگا"۔ چنانچہ بد روحوں کے نکالنے کی ایک وجہ اُس نے یہ بیان کی تھی کہ وہ بہادر شخص جو اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے یعنی شیطان ضرور ہے کہ پہلے باندھا جائے پیچھے اُس کے گھر کو لوٹ سکتے ہیں شیاطین کا نکالنا اُس بہادر شخص کو باندھنا تھا ۔ یہ ابتدائی کام تھا کہ انسان کی روح کو ساری شیطانی تاثیروں سے پاک کر کے اپنے ہاتھ میں لائے اور یہ اس امر کا نشان تھا کہ خدا کی سلطنت یا حکومت فی الحقیقت آدمیوں کے درمیان شروع ہوگئی ہے ۔ (لوقا ۲ : ۲۰) ۔

مگر آجکل یہ خیال لوگوں کے دلوں میں سمایا ہے کہ اگر اناجیل میں سے اعجازی بیان کو نکال دیں تو مسیحی دین زیادہ ترقی کریگا اور زیادہ مقبول عام ہوگا ۔ بہت لوگ جو مسیحی دین کی طرف مائل ہیں وہ معجزوں کو نہیں مانتے ہیں اور نہ اُن کو ضروری سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ میتھو آرنلڈ (Matthew Arnold) صاحب کہتے ہیں کہ " جس شخص یا کتاب کو میں عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اُس میں میری یہ آرزو ہے کہ وہ اعجازی بیان سے معرا اور مستغنی ہو ۔ اور ہارنک صاحب (Harnack) جو جرمن عالموں میں شہرہ آفاق ہے وہ مسیحی دین کی حقیقت بیان کرتے وقت معجزوں کو بالکل بالائے طاق رکھتا ہے " ہمیں یا تو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے ایمان کو ایک غیر مستقل اور غیر استوار بنیاد پر قائم کریں جس پر آئے دن نو بہ نو شکوک عائد ہوں یا ہم اُس بنیاد کو بالکل ترک کریں اور اس کے ساتھ ہی معجزوں کے دعوے کو ۔" اور پھر وہ یہ کہتا ہے کہ " ہمیں پختہ یقین ہے کہ زمان و مکان میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ حرکت کے قوانین عامہ کے تابع ہے اور اس معنی میں ترتیب فطرت میں خلل اندازی کے لحاظ سے کوئی ایسا واقعہ نہیں ہو سکتا جسے ہم معجزہ کہہ سکیں " ۔

نہ صرف ان مسلمہ غیر مسیحی علما کا یہ دعوے ہے بلکہ بعض ایماندار بھی

اسی حالت اضطراب میں ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر رشدل صاحب (Dr. Rashdall)
جو بڑے لائق فلاسفر موحد ہیں گو یہ مانتے ہیں کہ جی اٹھنے کے بعد مسیح
محض خیالی یا تمثیلی طور پر شاگردوں کو دکھائی نہیں دیا" لیکن معجزوں
کے بارہ میں وہ بڑے زور سے یہ کہتے ہیں کہ" جن لوگوں نے اناجیل کو
تاریخی روشنی میں مطالعہ کیا ہے یا جو لوگ اس تاریخی تحقیقات کے باعث
شک کی حالت میں ہیں جن کو آجکل سکیپٹک (Sceptic) کہتے
ہیں ان کے نزدیک نہ کوئی مذہبی عقیدہ بالعموم یا دیگر مذہبی مسئلہ ایسے
خلاف فطرت واقعات پر موقوف ہو سکتا ہے جو کسی گزشتہ زمانہ میں واقع
ہوئے تھے"۔

زیادہ شہادتوں کو پیش کرنا ضرور نہیں۔ ہر شخص آجکل جانتا ہے کہ بہت
لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اناجیل کے معجزے ہمارے خداوند کی زندگی کی
سادگی اور خوبصورتی پر داغ لگاتے ہیں اور کبھی ان کا کچھ مقصد ہو تو ہو یہ
شکیہ امر ہے آجکل تو جتنا کم ان کا ذکر کیا جاے اتنا بہتر ہے۔ چنانچہ
براؤننگ (Browning) انہیں اُن خشک ٹہنیوں سے تشبیہ
دیتا ہے جو کسی پھول کے نئے پودے کے گرد حفاظت کے لئے لگائی
جاتی ہیں تاکہ کوئی چرند پرند اُسے کھا نہ جاے۔ لیکن جب پودا بڑھگیا
اور اس جھاڑی سے بھی مضبوط اور بلند ہو گیا تو اُن لکڑیوں کو کوڑے کرکٹ
میں ڈال دیتے ہیں۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ مسیحی دین کی اخلاقی تعلیم اگر معجزوں سے الگ
کردی جاے تو وہ سب سے اعلےٰ اور سب کو موہنے والی ثابت ہوگی اور
جب تک ہمارے خداوند کے معجزے اُسکے مکاشفہ کا اصلی جُز نہ سمجھے
جائیں وہ ایمان میں بجاے مدد کے رُکاوٹ کا باعث ہونگے۔ لیکن
یسوع نے شفا کے معجزوں کو اپنے کام کا اصلی جُز سمجھا۔ پس جو شخص
معجزوں کے باعث حالت اضطراب میں ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کو ہم

رد کر سکتے ہیں وہ ان کو اسی نظر سے نہیں دیکھتا جن سے ہمارا خداوند دیکھا کرتا تھا۔ پس یہ دریافت کرنا نہایت ضرور ہے کہ ہمارا خداوند معجزے کو کیا سمجھتا تھا ؎

کسی نے حال ہی میں خوب کہا ہے کہ "اگر مسیح نے زمین پر اپنی خدمت کے قلیل عرصہ میں شفا کے جسمانی معجزات کے لئے وقت صرف کرنا مناسب جانا تو کس قدر مناسب ہمارے لئے ہے کہ ہم اس امر کو شکرگزاری کے ساتھ قبول کریں اور بے کم و کاست ان کو دوسروں تک پہنچائیں کہ کس طرح سے اُس نے اپنی مہربانی سے انسانی ضرورت کے وقت مدد دی اور بار بار انسانی ایمان ان سے طلب کیا ؎

خاص امور غور طلب یہ ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یسوع نے معجزوں کا دعوےٰ کیا تو ہم یسوع کے بارہ میں کیا طلب کرتے ہیں کیا محض ایمان سے شفا دینے یا کسی اعلےٰ قدرت کے ہم مدعی ہیں۔ خود مسیح نے معجزوں کو کیا رتبہ دیا اور کیا مقصد اُن سے منسوب کیا۔ اور یسوع کے سارے کام کے ساتھ جس میں اُس نے باپ کا مکاشفہ ہمیں عطا کیا معجزوں کا کیا تعلق تھا۔ ان امور پر غور کرنے کے بعد ایک یا دو عام اعتراضوں کا ذکر بھی ہم کرینگے ؎

(۱) اوّلاً۔ اناجیل کا دعوےٰ یہ ہے کہ یسُوع میں محض بیماروں کی شفا کی قدرت نہ تھی بلکہ اس سے کہیں اعلےٰ۔ ایسی قدرت جسے وہ اور ہم اعجازی کہتے ہیں۔ یہاں اس بات کی توچنداں ضرورت نہیں کہ معجزہ کی کوئی خاص محدود تعریف کی جاوے۔ لیکن تشریح کے لئے ایک دو جملوں کی ضرورت ہوگی۔ نئے عہدنامہ میں اس کے لئے چار لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی عجیب۔ نشان۔ کام اور قدرت۔ لفظ معجزہ صرف پہلے نام کے مطابق ہے اور باقی تین ناموں کی حقیقت اس سے ظاہر نہیں ہوتی۔ معجزہ محض ایک عجیب کام نہیں جس سے کہ لوگوں کی توجہ

اُس طرف منعطف ہوا جیسے جان فاسٹر صاحب (John Foster) نے کہا کہ یہ " جہان کے گھنٹے کا بجانا ہے " بلکہ یہ کسی روحانی حقیقت اور سچائی کو ظاہر و منکشف یا مشرح کرتا ہے۔ اور یہ ایک احسان اور مہربانی کا کام ہے اور اُس فرض کا جزو ہے جو باپ نے بیٹے کو پورا کرنے کے لئے دیا تھا۔ علاوہ ازیں معجزہ ایک قدرت ہے جو انسانی طاقت سے باہر اور انسانی ضرورتوں کو رفع کرنے کے لئے ایک اٹل طاقت ہے*

پس جب ہم یسوع کے معجزوں کا ذکر کرتے ہیں تو ہم مفصلہ ذیل امور کو یاد رکھیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی شے کی تعریف کے بغیر ہم اُس کو بہتر جان لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسی تعریفوں کی ضرورت ہو تو ٹرینچ اور موزلے وغیرہ علما کی کتابوں میں کثرت سے مل سکتی ہیں معجزوں کی دو دلچسپ تشریحیں کی گئیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ایک اعلٰے قانون سے کام لیا گیا جس سے کہ ہم ناواقف ہیں۔ دوم یہ کہ معجزہ الٰہی ارادہ کا ایک بلاواسطہ فعل اور عمل ہے۔ کارلائل صاحب نے پہلی تشریح کی بہت تاکید کی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ بہت لوگ یہ پوچھا کرتے ہیں کہ کیا حقیقی معجزہ قوانین فطرت کو توڑتا نہیں۔ ان کو میں یہ جواب دیتا ہوں کہ تم قوانین فطرت کسے کہتے ہو۔ میرے نزدیک مُردوں میں سے جی اُٹھنا قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں بلکہ ان کی تصدیق ہے کہ شاید کوئی نیا اعلٰے قانون داخل ہوا ہے جیسے روحانی طاقت نے اپنی مادی طاقت کے ساتھ ہم پر ظاہر کیا " لیکن یہ رائے تحقیق کے درجے تک نہیں پہنچی۔ اور نہ پہنچ سکتی ہے*

معجزے کو الٰہی ارادہ کا بلاواسطہ عمل اور فعل سمجھنا اسکی تسلی بخش تشریح ہے۔ اس کا ہم خود ثبوت ہیں کیونکہ ہم میں روح بلاواسطہ مادہ پر اثر کرتی ہے۔ ہمارا ارادہ جو غیر مرئی۔ غیر محسوس اور روحانی ہے ہمارے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا کو حرکت دیتا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ یہ کیسے عمل میں آتا ہے

یہاں روح بلا واسطہ مادّہ پر اثر کرتی ہے۔ اس تجربہ سے واقف ہو کر یہ غیر ممکن معلوم نہیں ہوتا کہ الٰہی ارادہ بلا واسطہ مادّی جہان پر اثر کرے اور ایسے نتائج پیدا کرے جو ایسے ارادہ کے داخل ہونے کے بغیر پیدا نہ ہو سکتے تھے۔

ہمارے خداوند کا یہ دعوےٰ ہے کہ یہ معجزے وہ کام ہیں جو مجھے باپ کی طرف سے کرنے کو ملے ہیں۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ یہ معجزے یسوع کی مرضی سے وقوع میں آئے لیکن اس کی پشت پر الٰہی ارادہ تھا۔ اس لئے اس نے یہ بیان کیا کہ جو کوئی خدا پر ایمان لاتا ہے اسے معجزے کرنے کی طاقت مل سکتی ہے "تمہاری کم اعتقادی کے باعث۔ کیونکہ میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ اگر تم میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا تو تم اس پہاڑ سے کہوگے کہ تو اُکھڑ جا اور سمندر میں جا پڑ تو یہ ہو جائیگا۔ اور تمہارے لئے کچھ ناممکن نہ ہوگا" پطرس کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر تجھ میں کافی ایمان ہوگا تو تو بھی میری طرح پانی پر چل سکیگا۔ یہ یسوع کی کوئی علیحدہ طاقت نہ تھی اور نہ اُسکی شخصیت کا یہ جادو تھا بلکہ باپ کے ساتھ قربت رکھنے پر یہ طاقت موقوف تھی۔ جیسے اُس نے اُس نوجوان کو جس نے اُس کو نیک کہا تھا جھڑکا اور کہا کہ کوئی شک نہیں بلکہ ایک ویسے وہ اپنے معجزوں کے بارہ میں کہہ سکتا تھا کہ کوئی خدا کے سوا قادر نہیں۔ یہ قابل لحاظ ہے کہ ہمارے خداوند نے اپنے ان کاموں کو خدا کی مرضی سے منسوب کیا۔ اس امر کے ذریعے اُس میں اور طب روحانی یا ایمان کے ذریعے شفا دینے والوں میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ ہم اس کا تو انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارے خداوند کے بعض معجزے بیماروں کی شفا کے دوسرے لوگ بھی بذریعہ ایمان کر سکتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں ایسے شفا کے کاموں کی حقیقت پر شک کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ خود سائنس نے نہ صرف ان کی صداقت ظاہر کر دی ہے بلکہ ان کی حقیقت کو بھی ظاہر کیا ہے۔ کئی عالموں نے اپنی تصنیفات میں اس امر کو خاص طور سے ثابت کر دیا ہے کہ بعض بیماریوں کی شفا میں شفا پانے کی

توقع بڑی ممد ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر کارنیٹر اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے۔ کہ وہ شفا پانے کی پوری امید نہایت یقینی وسیلہ اس شفا پانے کا ہے۔ اور ایسی حالتوں میں بھی اس کا زور ظاہر ہوا ہے جہاں طبی علاج ناکامیاب رہا۔ اور یہ عام نتایج مختلف زبانوں اور مختلف اشخاص کی تحریر میں آچکے ہیں۔ البتہ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ بعض صورتوں میں بعض بیماروں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم اچھے ہو گئے حالانکہ فی الحقیقت ان کو شفا حاصل نہ ہوئی تھی تو بھی کثرت سے ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں اور معتبر شہادت سے ثابت ہے کہ پوری شفا حاصل ہوئی اور دوسروں نے اس کی تصدیق کی کہ سوائے ایمان اور پوری توقع شفا کے اور کسی وسیلہ سے ان کو یہ شفا نہیں ملتی"۔

علم طب کی اس تصدیق کو کہ محض شفا پانے کی امید سے شفا حاصل ہوئی بعضوں نے مسیح کے معجزوں کی تشریح میں قبول کر لیا ہے وہ شفا یابیاں درحقیقت عمل میں آئیں اور ان سے دوسرے اعلیٰ معجزوں کی طرف لوگوں کی توجہ ہوئی۔ یہ شفا یابیاں آج کل قوانین فطرت کے عین مطابق سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے خداوند کے دنوں میں وہ اعجازی مانی جاتی تھیں۔ اور جب ایک دفعہ معجزہ کا دروازہ کھل گیا بیشمار لوگ بلا جائز پروانہ راہ گزری کے اس میں گھس آئے۔ ہر اہل فکر کو یہ تشریح پسند آئے گی۔ لیکن اس تشریح سے ہم کو بوجوہات ذیل تشفی نہیں۔

(۱) گو بعض امور میں یہ علاج طب روحانی یا ایمانی علاج سے مشابہ ہیں لیکن دیگر امور میں وہ بالکل متفرق ہیں۔ وہ اس امر میں تو مشابہ ہیں۔ کہ اُن کے لئے مریض میں ہمیشہ ایمان کی ضرورت ہے اور جہاں مریض میں ایمان کی کمی تھی وہاں ہمارا خداوند قدرت کے کام نہ کر سکا۔ بعض موقعوں پر وہ ایمان صرف شفایابی کی توقع تھی۔ ایک عام پر وسواس جاہلانہ توقع لیکن ہمارا خداوند مریض کے ایمان کو شفایابی کا کلیہ واحد شرط نہیں ٹھیراتا۔ اس کا اپنا ایمان ہمیشہ اعلیٰ الٰہی ارادہ پر تھا۔ لعزر کو جلانے سے پیشتر اس نے دعا مانگی۔

اس نے یہ بھی بیان کیا کہ ایک خاص قسم کی جھاڑ پھونک دعا کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔ ایک طرف تو وہ مریض کے ساتھ اپنے تئیں ایسی ہمدردی کے رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے کہ اس کی نسبت یہ کہہ سکتے تھے کہ "اس نے ہماری کمزوریاں لے لیں اور ہماری بیماریاں اٹھالیں"۔ اور دوسری طرف وہ باپ کی مرضی کا خالص وسیلہ ہوگیا ۔

محض ہاتھ کے اشارہ یا محض ایک منتر یا جملہ کے وسیلہ شفا نہ ملتی تھی۔ کہ اس طرح سے کہ ایک طرف تو وہ اپنے تئیں مریض کا قائمقام بنا دیتا تھا اور دوسری طرف خدا کی مرضی کے ساتھ عین مطابقت رکھتا تھا ۔

کوئی یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ ہمارے خداوند کی یہ غلطی تھی کہ اس نے یہ سمجھ لیا کہ ان علاجوں کے ساتھ خدا کی خاص مرضی کا تعلق تھا۔ وہ تو معمولی قوانین کی مثالیں تھیں کہ علاج کی توقع بلا لحاظ ایسی مداخلت کے بعض بیماریوں میں عجیب نتایج پیدا کرتے تھے۔ ہم تو ایسی نادانی اپنے خداوند سے منسوب نہیں کرسکتے۔ لیکن ہر حالت میں یہ امر تو قائم رہتا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے عین مطابق ہونے سے واقف تھا اور اس لئے اس کے ہاتھوں میں یہ کام انسانوں کے لئے خدا کی رضامندی کا اظہار تھے ۔

لیکن (۲) علاوہ اس کے یہ محض نسوں کے متعلق ہی بیماریاں نہ تھیں جن کو اس نے چنگا کیا۔ اُس نے کوڑھیوں کو شفا دی بخار دور کئے اور دیگر مرضوں کو شفا دی۔ بعض موقع پر دور ہی سے جہاں چھونے کا موقع ہی نہ تھا اُس نے مریض کو اچھا کر دیا اور مُردوں کو جلایا اور طوفان و آندھی کو موقوف کیا۔ دریا پر چلا۔ اور لاکلام ان کا ثبوت ہمارے اس علم پر موقوف نہیں کہ یسوع کی طاقتیں معمولی انسانوں کی طاقتوں سے مشابہ ہیں بلکہ اس تصور پر جس میں وہ اوروں سے ممیز تھا۔ اگر ہم اس کا یہ دعویٰ مان لیں کہ وہ موعود مسیح تھا اور کہ وہ خدا سے ایک کامل غیر منقطع تعلق و اتحاد رکھتا تھا تو ہمیں اس بات کے ماننے میں کچھ دقت نہ ہوگی کہ غیر معمولی کام اس کے زمانہ میں ظاہر ہوں ۔

(۳) اور یہ بھی یاد رہے کہ امور فطرت پر اس کے جو معجزے بیان ہوئے ہیں اُن کے لئے ویسی ہی شہادت ہے جیسے اس کے شفائے امراض کی کی شہادت۔ یہ دلیل ہم کو ان کے ماننے پر مجبور تو نہیں کرتی لیکن یہ تو بیان کرنا پڑے گا کہ اناجیل میں وہ کیوں درج کئے گئے۔ عموماً اُنکی نسبت معترض یہ کہتے ہیں کہ جس دوسری پشت میں یہ اناجیل لکھی گئیں اُن کی رایوں کا بہت کچھ دخل ہوا۔ لیکن یہ راے بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ اس پشت میں مسیح کے معجزوں کا بہت کم ذکر ہوا۔ نہ تو پولوس کے خطوں میں اس کا ذکر ہے اور نہ اعمال کی کتاب ایک دو دفعہ کے سوا اُن کی طرف اشارہ ہے اور ڈاکٹر چیس (chase .ڈی.ڈی) نے بخوبی ظاہر کر دیا کہ "یہ مفید تاریخی دلیل اس دعوے کے خلاف ہے کہ جن دنوں میں اناجیل لکھی گئیں ان دنوں میں مسیحیوں کے درمیان یہ سیلان طبع تھا جس کی وجہ سے خداوند کی سوانح عمری میں فسانہ آمیز معجزے داخل کئے گئے"۔

اگر ہمیں معجزہ کو قبول کرنا ہے۔ تو ہمیں پہلے یہ دریافت کرنا چاہئے۔ کہ اس کا منشا و مقصد کیا ہے۔ یعنی مسیح کے کل کام سے اس کا تعلق کیا ہے۔ معجزے کرنے میں ہمارے خداوند کا مقصد کیا تھا؟ جواب یہ ہے کہ اُس نے معجزے اس غرض سے نہیں کئے کہ لوگوں کو اپنے مسیح ہونے کا یقین دلائے۔ وہ موعود مسیح خدا کا رسول اور ایلچی تھا اور چونکہ وہ خدا کی محبت کی ایسی پہچان اور خدا کے ساتھ ایسی کامل شراکت رکھتا تھا اس لیئے وہ مسیح تھا۔

اس نے معجزے اس غرض سے نہیں کئے کہ لوگوں کو اپنے مسیح ہونے کا یقین دلائے۔ شروع سے یہ اس کی عام آزمایش تھی۔ لوگ یہ توقع رکھتے تھے کہ کسی بڑے عجیب نشان کے ذریعے مثلاً ہیکل کے کنگورے سے کود پڑنے کے ذریعہ وہ اپنے تئیں مسیح ظاہر کرے۔ چونکہ ایسا نشان اُس کے کام کے روحانی پہلو سے بالکل متفرق تھا اس لئے اس نے ایسی درخواست کو فوراً رد کر دیا۔ اور نہ اس نے یہ عجیب کام لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے

کے لئے کئے تھے۔ اُن کا مقدم منشا یہ تھا کہ مصیبت کو کم کرے۔ وہ اس لئے آیا تھا کہ آدمیوں کے درمیان خدا کی سلطنت کو مشتہر اور قائم کرے یعنی خدا کی حضوری اور محبت کو ظاہر کرے۔ یہ مقصد اس کی تعلیم کی نسبت شفا کے معجزوں کے ذریعہ زیادہ موثر طور سے پورا ہوا۔ انہیں معجزوں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں پر خدا کے رحم کا نقشہ بٹھایا۔ یہ معجزے باپ کی ہمدردی کا مکاشفہ تھے مسیح نے محسوس کیا کہ یہ بیماریاں خدا کی سلطنت کے ساتھ مطابق نہیں ہوسکتی اور اس نے جان لیا کہ اگر مجھے وہ سلطنت لوگوں کے سامنے ظاہر کرنی ہے تو نہ صرف روحانی طور پر بلکہ طبعی طبقہ میں بھی اُس کو آشکارا کرنا چاہئے۔ اور جب کبھی بیماری یا موت پر اُس کی نظر پڑتی تو اپنے دل میں بہت غم کھاتا تھا اس نے محسوس کیا کہ خدا نہیں چاہتا کہ یہ جہان ایسی حالت میں رہے۔ اور جہاں تک وہ آدمیوں کی مصیبتوں کو دور کرسکتا تھا اس نے کیا۔ یہ شفا یابیاں وہ کام تھے جس کو باپ نے کرنے کے لئے اُسے دیا تھا۔ وہ خدا کی محبت کا مکاشفہ تھے۔ کیونکہ وہ محض ترس اور رحم کے باعث باپ کے نام سے اور باپ کی قوت سے اس نے سرانجام دئے۔ جیسے خدا کی قدرت سے اس نے وہ علاج کئے ویسے ہی خدا کی محبت سے اس نے یہ کام کئے اور اس لئے وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ اگر میں خدا کی انگلی سے دیوؤں کو نکالتا ہوں تو خدا کی سلطنت تمہارے نزدیک آپہنچی"۔ یہ کام خدا کی حضوری کے موافق تھے۔ اور ایسے نتایج پیدا کئے جن سے وہ سلطنت نمایاں ہوئی÷

چونکہ معجزوں کا مقدم مقصد یہ تھا کہ خدا کی رحمت کا اظہار کرے۔ اور نہ یہ کہ ہمارے خداوند کے مسیح ہونے کو ثابت کرے۔ اسی لئے ہم اُن کو اس امر کی شہادت کے لئے پیش کرسکتے ہیں کہ یسوع ہی مسیح تھا۔ شاعر نظم بناتا ہے اس لئے کہ وہ شاعر بنے نہ اس لئے کہ وہ دنیا کو قائل کرے کہ میں شاعر ہوں تو بھی اُس کی ایسی تحریر دنیا کو قائل کردیتی ہے کہ وہ شاعر ہے۔ فیاض شخص ٹھیک ایسا ہی کرے گا جیسے مسیح نے کیا تھا جب اس نے

ایک شخص کو شفا دی اور اُسے حکم دیا کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرے۔ اور جس شخص کو یہ علم حاصل ہو جاتا ہے وہ ایسے شخص کو ضرور سخی اور مہربان جانے گا لیکن جب کوئی کام اس لئے کیا جاتا ہے۔ کہ اس کے باعث لوگ اسے بہادر یا رحیم وغیرہ سمجھیں تو بجائے ایسی سیرت پیدا ہونے کے ظاہرداری اور دکھاوے کی طبیعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ مسیح کے معجزوں کا مقدم مقصد یہ تھا کہ لوگ مسیح کو ایسا یا ویسا سمجھیں بلکہ یہ تھا کہ غریب اور محتاجوں کی مدد کرے اور یوں خدا کی محبت کا اظہار کرے۔ اس لئے ان معجزوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدا کا وکیل اور نئی سلطنت کا سلطان تھا۔ اور اسی لئے یسوع مسیح کبھی کبھی اپنے معجزوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور پھر یہ کہ "گو میرا یقین نہ کرو مگر اُن کاموں کا تو یقین کرو"۔

مقدس متی نے (۱۶ باب ۱ سے ۴) اس مضمون کے متعلق ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے جو ہمارے خداوند اور فریسیوں اور صدوقیوں کے مابین ہوئی۔ یہ لوگ اس کے پاس آن کر اُس سے ایک آسمانی نشان طلب کرتے تھے اور یہ کہکر اُسے آزمانا چاہتے تھے کہ اگر تم ایسا قطعی نشان دکھاؤ گے تو تمہارے مسیح ہونے کے بارہ میں کوئی شک نہ رہیگا۔ اس درخواست کا جواب یہ دیا گیا "شام کو تم کہتے ہو کہ کھلا رہیگا کیونکہ آسمان لال ہے اور صبح کو یہ کہ آج آندھی چلے گی کیونکہ آسمان لال اور دھندلا ہے۔ تم آسمان کی صورت میں تو تمیز کرنی جانتے ہو مگر زمانوں کی علامتوں میں تمیز نہیں کر سکتے تم فطرت کے نتایج کو تو جانتے ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ فلاں فلاں کا نتیجہ ہمیشہ یہ یا وہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن تم روحانی نتایج کو نہیں دیکھ سکتے۔ تم سمجھ نہیں سکتے کہ ایک حیرت افزا کام یا فوق العادت عجوبہ جس کو دیکھکر لوگوں کی عقل حیران ہو۔ مسیح کی سلطنت کی برکتوں سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا۔ اور تمہاری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ تمہارے بیچ میں ایسے شخص کی موجودگی جو خدا سے کامل اتحاد رکھتا اور انسان کی بہبودی دل وجان سے چاہتا ہے وہ ایسے

موسم پیدا کر دے گی جو روحانی جہاں میں بالکل نیا ہو۔ تم دیکھ نہیں سکتے کہ ایک کامل انسان کو جہاں پر وارد ہونا۔ یعنی خدا کا انسانی صورت میں ظاہر ہونا اور اپنی کامل الہی محبت اور قدرت کو انسانی احتیاجات کے رفع کرنے میں صرف کرنا بڑے سے بڑے طبعی معجزے کی نسبت نوع انسان کے لئے زیادہ مفید ہے۔ فرض کرو کہ آپ کے دیکھتے دیکھتے جب کہ مطلع بالکل صاف ہو سورج کو بادل سے چھپا دوں یا پہاڑوں کو اپنے حکم سے ایک جگہ سے دوسری جگہ سرکا دوں یا ہیکل کے کنگرہ سے چھلانگ مار کر صحیح سلامت صحن میں آگروں تو ایسے عجیب فعل کا کیا تعلق انسانوں کے درمیان خدا کی سلطنت کے قایم کرنے سے ہوگا یا گناہوں سے مخلصی پانے کے ساتھ اُس کا کیا ضروری رشتہ ہوگا۔ ایسے ماجرے کو دیکھکر تم کچھ نہیں بتا سکتے کہ کیا واقع ہوگا۔ لیکن اگر تم وقتوں کے نشانوں کو سمجھ سکو تو تم بلاشبہ یہ کہہ سکتے ہو کہ اگر کوئی ایسا شخص جس کا کامل اتحاد خدا کے ساتھ ہو جہان میں داخل ہو تو ممکن نہیں کہ نوع انسان کو اس سے غیر محدود اور لازوال فوایدحاصل ہوں ॥

چوتھی انجیل میں بار بار اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ یسوع کی شخصی عظمت پر جو لوگ ایمان لاتے ہیں اُن کا ایمان ان لوگوں کے ایمان سے زیادہ مضبوط تھا جو معجزے دیکھکر ایمان لائے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ معجزے دیکھکر کسی میں ایمان پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے خداوند نے نکودیمس کو کہا کہ خدا کی سلطنت روحانی سلطنت ہے اور وہی لوگ اسے پہچان سکتے ہیں جو روح سے پیدا ہوتے ہیں۔ صرف وہی اس میں داخل ہو سکتے ہیں جو روحانی رشتوں سے کھچ کر اس کی طرف آتے ہیں۔ اہل بصارت ہی اس کے دعاوی کو تسلیم کرتے تھے۔ یعنی جو لوگ الہی انسان کو پہچان سکتے اور الہی جلال کو محسوس کر سکتے تھے جو فروتنی اور سب کا خادم ہونے میں پایا جاتا ہے لیکن معجزے ایسے لوگوں کے لئے ابتدائی سبق کا کام دیتے تھے جو روحانی

امور کے سمجھنے میں بہت تیز فہم نہ تھے۔ جب اس نے اندھوں کو بینائی بخشی تو اُس نے ظاہر کیا کہ خدا روحانی اندھاپن کو دور کرنا چاہتا ہے جب اُس نے بھوکوں کو کھانا کھلایا تو اس نے ظاہر کیا کہ تمہارا آسمانی باپ تمہاری برداشت کرنا اور تمہیں محتاج دیکھنا نہیں چاہتا۔ جب اس نے ناتواں کو توانائی بخشی تو اس سے اُس نے صاف دکھایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم ابدی زندگی حاصل کرو۔ پس معجزے اس مکاشفہ کا جائز اور ضروری جز تھے۔ جو باپ نے مسیح کے وسیلے ہمیں بخشا +

جو شخص یہ سمجھتے ہیں کہ مسیح کے معجزوں کا خاص فایدہ شہادت دینا تھا یا یہ کہ اس کا منشا مطلق شہادت دینا نہ تھا وہ غلطی کرتے ہیں اور جو لوگ اُن کو ایمان میں ممد ہونے کی بجائے ایمان میں رکاوت خیال کرتے ہیں وہ بھی خطا کرتے ہیں۔ بلکہ انجیل میں ان کا اس قدر طوالت کے ساتھ مذکور ہونا اور مسیح کی زندگی میں ان کا ایک بڑا حصہ لینا ہی ایک بڑا ثبوت اس امر کا ہے کہ اُن سے بڑا مقصد پورا ہوتا تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ باپ کی محبت کو انسان کی خستہ حالت کے ساتھ علاقہ دے۔ معجزے صلیب سے دوم درجہ پر خدا کی محبت کے اظہار کا اعلیٰ وسیلے تھے +

انجیل کے معجزوں پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں وہ عموماً دو ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ ثابت نہیں ہوسکتے۔ دوم یہ کہ وہ گو ثابت بھی ہوجائیں بے سود ہیں +

یہ اعتراض جو کبھی کیا جاتا تھا کہ معجزے احاطہ امکان سے باہر ہیں آج کل بہت نہیں کیا جاتا (Spinoza) سپائی نوزا کے وقت سے جس نے یہ کیا تھا کہ "معجزہ خواہ خلاف فطرت ہو خواہ فوق الفطرت محض بیہودگی ہے"۔ اب رائے میں بہت کچھ تبدیلی واقع ہوگئی ہے جس دلیل سے وہ اس نتیجہ تک پہنچا وہ دلچسپ اور تعلیم بخش ہے۔ وہ دلیل یہ تھی۔ قوانین فطرت کے الگ فطرت کچھ واقع نہیں ہوتا۔ ان قوانین

کا دائرہ ایسا وسیع ہے کہ جو کچھ خدا کے دل میں گزرتا ہے وہ بھی اسی قانون میں داخل ہے۔ اور فطرت کی رفتار مقررہ اور بے تبدیل ہے پس یہ لفظ معجزہ انسانوں کی رائے سے تعلق رکھتا ہے کہ جس کا سبب عام فہم مثال سے معلوم نہ ہو سکے اس کو وہ معجزہ کہنے لگ جاتے ہیں۔ ...... میں البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ معجزہ وہ ہے جس کا سبب ہماری فطری فہم کے ذریعہ فطرت کے معلومہ اصولوں سے دریافت نہ ہو سکے

اس دلیل کا لب لباب بعض دیگر سائنس دانوں کی تصنیفات میں بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ ساری فطرت مع اس کے قوانین کے الہی ارادہ کا اظہار ہے۔ اگر کچھ ان قوانین کے خلاف واقع ہوتا ہے تو وہ ضرور خدا کی مرضی کے خلاف واقع ہوگا۔ لیکن اس دلیل میں ایک بڑا مغالطہ ہے یہ دائرہ میں دلیل لاتا ہے یعنی جس امر کو ہم نے ثابت کرنا ہے اسی کو وہ پہلے مسلم قرار دیتا ہے۔ کیا فطرت میں خدا کی پوری مرضی کا اظہار ہے؟ دراصل سیائی نوزا کی اس دلیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معجزوں کے امکان کا سوال دراصل یہ سوال ہے۔ کہ کیا خدا فوق العادت ہے؟ یہ مانا کہ الہی حیات ساری فطرت میں ساری ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی اعلے مرضی بھی ہے جو فطرت کے قوانین کی مقید نہیں۔ اور بعض موقعوں پر بلا لحاظ ان قوانین کے اپنے تئیں ظاہر کر سکتی ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ کیا خدا اور فطرت ایک ہی امر ہے یا خدا فطرت سے متفرق اور اس سے اعلیٰ ہے +

لیکن اب یہ دلیل متروک ہو گئی ہے۔ پرفیسر ہکسلے (Huxley) نے بڑے زور سے اس کی تردید کی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ " مجھے اب تک معلوم نہیں کہ کسی شے پر ناممکن کا نام آسکتا ہے سوا ئے ان اصطلاحات کے جو ضدین ہوں منطقی ناممکنات تو ہیں لیکن طبعی ناممکنات نہیں۔ مثلاً مدور مربع۔ حال ماضی دو متوازی خطوط جو ایک دوسرے کو قطع

کرتے ہوں وغیرہ ناممکنات میں سے ہیں۔ کیونکہ جو تصورات ان اصطلاحات مدّور حال اور قطع کرنے سے پیدا ہوتے ہیں وہ ان تصورات کی ضد ہیں جو الفاظ مربع۔ ماضی اور موازی سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن پانی پر چلنا۔ یا پانی کا مے بنا دینا۔ یا نر کی بلا وساطت اولاد کا پیدا ہونا یا مردوں کا زندہ ہونا ناممکنات نہیں ہیں۔ البتہ اگر ہم فطرت کے سارے ممکنات سے واقف ہو گئے ہوتے تو شاید ہم یہ کہہ سکتے کہ فلاں شے ناممکن ہے لیکن ہم تو ابھی مبتدی ہی ہیں منتہی نہیں بنے۔ اور ہماری قابلیتیں ایسی محدود ہیں کہ ہم شاید کبھی بھی فطرت کے سارے کاروبار اور کائنات کے عجائبات پر قادر اور حاوی نہ ہو سکیں گے۔ جو کچھ واقع ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے ہم تو صرف اسی سے واقف ہیں۔ اور جو کچھ واقع ہونے والا ہے اس کی نسبت صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ ایسی توقع اور امید ہے۔ اس سے بڑھکر اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ جو تجربہ زمانہ ماضی میں ہو چکا ہے اس سے یہ امید نکلتی ہے کہ آیندہ کو ایسا یا ویسا ہوگا۔ اس عبارت میں پروفیسر صاحب نے الہی ارادہ کو دخل نہیں دیا اور اس لئے اناجیل کے معجزوں کو بھی وہ نہیں چھوتا۔ فطرت میں ہمارے لئے بہت عجائبات ہیں لیکن ہم تو تجربہ ہی سے ہدایت پا سکتے ہیں کہ آیندہ کے لئے ہم کو کیا توقع رکھنی چاہئے۔ الغرض اس کے نزدیک کسی واقعہ کی نسبت جو قانون فطرت کے خلاف ہو ناممکن ثابت کرنا ناممکن ہے +

پس آج کل یہ تو اصرار نہیں ہوتا کہ معجزے بذات خود ناممکن ہیں لیکن اس پر زور دیا جاتا ہے۔ کہ اس کا ثبوت ملنا ناممکن ہے اور ہیوم کے اس اعتراض پر زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ دو تاریخ عالم میں کوئی ایسا معجزہ پایا نہیں جاتا کہ جس کی تصدیق ایسے آدمیوں کے معقول گروہ نے کی ہو۔ جن کے چلن اور تعلیم اور علم

پر کوئی دھبہ نہ ہو اور جس سے ہم کو یقین ہو جائے کہ اُنہوں نے کسی قسم کا دھوکا نہیں کھایا۔ اور جن کی دیانت اور راستی ایسی اعلیٰ و افضل ہو کہ کوئی نہ کہہ سکے کہ وہ کسی قسم کا فریب دینا چاہتے تھے۔ کہ وہ لوگ ایسے معتبر اور معزز ہوں کہ جن کا راز افشا ہو جانے سے اُن کی عزت کو سخت بٹا لگے۔ اور ساتھ ہی وہ کام ایسے عام طریقہ سے واقع ہوئے ہوں اور جہان کے ایسے مشہور حصہ میں کہ دھوکے اور فریب کا امکان باقی نہ رہے اور آدمیوں کی شہادت میں ہمیں ان سارے امور کا یقین ہو جانا چاہئے۔ انجیل کے معجزوں پر ایسے اعتراض کا کیا اثر ہو گا ڈاکٹر راشڈل (Rashdall) کی تحریر سے ظاہر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "طبعی قانون کا معطل ہونا بذات خود ناقابل اعتبار نہیں لیکن چونکہ ایسے امر کا ماں لینا ہر طرح کے معیار کو خواہ وہ سائنٹفک ہو یا تاریخی صدمہ کر دیتا ہے قانون کے معطل ہونے کو مان لینا مشکل ہے جب تک کہ اس امر کی شہادت کافی نہ ہو۔ لیکن زمانہ ماضی کے واقعات کی ایسی شہادت ملنا دشوار ہے۔ پس زمانہ گزشتہ میں ایسے واقعات کے بارہ میں جو فطرت کے ہموار قوانین میں گویا شگاف ہیں کافی شہادت کا حاصل کرنا نہایت محال سمجھا گیا ہے۔ اور قوانین فطرت کے مزید علم اور سائنس کی تحقیقات جدیدہ نے اس مشکل کو اور بھی بڑھا دیا ہے اور مزید ثبوت اور اعلیٰ شہادت ایسے امور کی طلب کی جاتی ہے"۔

علاوہ ازیں تاریخ کے مطالعہ نے ہم کو اس قابل کر دیا ہے کہ جن معجزوں کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان کا مقابلہ کریں۔ اور تب محقق متھیو آرنلڈ (Matthew Arnold) کے ان الفاظ پر صاد کریں گے "اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ انسان انجیل کے معجزوں کو دیگر معجزوں سے ایک الگ قسم میں شمار نہیں کرتے اور جس لحظ سے یہ وقت شروع ہوتا ہے اور جس لحظ سے مختلف مذاہب کے معجزوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔

شروع ہوتا ہے اسی وقت سے بائبل کے معجزوں کی فوقیت کافور ہوجاتی ہے" یہ مطالعہ معجزوں کے مقابلہ کرنے کا اب بڑی سرگرمی سے شروع ہوگیا ہے اور یہ ظاہر ہوگیا ہے۔ کہ بدھ اور باب اور ٹامس آبیکٹ اور فرانسس ساکن آسیسی کو فوق العادت قوتیں حاصل تھیں اور یہ کہا جاتا ہے۔ کہ یسوع کے معجزے دیگر بانیان دین کے معجزوں سے ایسے مشابہ ہیں کہ اگر ہم ایک کے معجزوں کو رد کریں تو دوسروں کے معجزوں کو بھی رد کرنا پڑے گا چنانچہ پرسی گارڈنر (Percy Gardner) صاحب نے اپنی ایک کتاب میں یہ لکھا ہے۔ کہ "خواہ ہم گزشتہ زمانہ کی تاریخ کی چھان بین کریں خواہ زمانہ حال کے کم غیر مہذب ممالک کی طرف اپنی توجہ پھیریں تو ہم معلوم کریں گے کہ مذاہب کے برپا ہونے اور ترقی کرنے میں جتنا معجزوں نے حصہ لیا ہے اتنا کسی اور امر نے نہیں لیا۔ نبی کی بات کوئی نہیں سنتا۔ جب انسان کہ اس کے پیرو اس سے معجزوں کی قوت منسوب نہ کریں اور انسانی فطرت کا یہ اٹل قانون معلوم ہوتا ہے کہ معجزے مقدسوں کے نقش پا کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں"۔ پروفیسر کارپنٹر (Carpenter) صاحب بھی یہی خیال پیش کرتے ہیں۔ "اصل بات یہ ہے کہ گزشتہ پشت کے مطالعہ نے یہ امر روشن کر دیا ہے کہ وحشی قوموں سے لیکر اعلیٰ مہذب قوموں تک سب میں معجزوں کا ذکر پایا جاتا ہے"

اب یہاں دو مشکلات ہمارے سامنے پیش آتی ہیں اور یہ کوئی وہمی اعتراض نہیں بلکہ جو شخص معقول ایمان کی تلاش کرے گا اسے یہ مشکلات بھی پیش آئے گی۔ جو معجزے یسوع سے منسوب ہیں وہ فطرت کے معلومہ قوانین کے خلاف ہیں اور بانیان دین اور مقدسوں سے عموماً معجزے منسوب کئے گئے ہیں۔ اور میرے نزدیک یہ دونوں مشکلات رفع ہوسکتی ہیں۔ اگر ہم اناجیل میں مندرجہ معجزوں کے موقعہ ان کی حقیقت اور ان کے

کرنے والوں پر غور کریں۔ تب تک ایسے معجزے کے لئے کہ سورج ٹھیر گیا۔ زیادہ مضبوط شہادت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ موقع اس معجزہ کا یہ تھا کہ زیادہ فاحش شکست ہو اور ہم شاید یہ بھی خیال کریں کہ جس عجیب معجزہ کا ذکر مقدس متی نے کیا اس کی کافی شہادت ہیں کہ مقدسوں کے مردہ بدن اپنی اپنی قبروں سے نکل کر لوگوں کو دکھائی دئے اور بلا مطلب۔ لیکن شفا کے معجزے اور مسیح کے جی اُٹھنے کا معجزہ ایسا ناقابل اعتبار معلوم نہیں دے گا جب ہم ان امور پر غور کریں گے۔ کہ موقعہ کیسا اہم تھا اور وہ معجزے کیسے بامعنی تھے اور ان معجزوں کا کرنے والا کیسا لاثانی شخص تھا۔

شاید پروفیسر ہکسلے کی طرح ایک مثال لیکر انجیل کے معجزوں سے اس کا مقابلہ کرنا زیادہ مفید ہوگا۔ وہ بڑے فخر سے یہ پوچھتا ہے کہ اگر کوئی ہم سے یہ آن کر بیان کرے کہ میں نے ایک جانور کو جس کا آدھا دھڑ انسان کا اور آدھا گھوڑے کا تھا شہر کی فلاں گلی میں چلتے دیکھا تو کیا کوئی شہادت ایسے واقعہ کو ہمارے نزدیک قابل اعتبار ٹھیرا دے گی۔ اس مثال سے صاحب موصوف کی بہت دانائی تو ظاہر نہیں ہوتی لیکن معجزوں کے مقابلہ کرنے میں اس قسم کی مثال سے ہمیں کچھ مدد ملتی ہے۔ دو طرح سے یہ مثال اناجیل کے معجزوں سے کچھ مشابہت نہیں رکھتی۔

(۱) ایسا جانور بذات خود ایک عجیب الخلقت ہے۔ حالانکہ اناجیل کے معجزے فطرت کے دائرہ میں ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ بیماروں کو شفا دینا۔ مردوں کو جلانا۔ یہ سب ان رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں جن سے فطرت کا اپنا مقصد پورا نہیں کرسکتی۔ یعنی یہ کہ فطرت انسان پر خدا کے احسان کا کامل اظہار ہے۔ لیکن بھوک اور بیماری وغیرہ ایسے اظہار کو دھندلا بنا دیتے ہیں۔ وہ ایسی کامل حالت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو فطرت کو ایک اور حاصل ہوگی۔ پس متھیو آرنلڈ کا وہ مقولہ جو پہلے بیان

ہرگز راست ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ برعکس اس کے بیان کے جب ہم یسوع کے معجزوں کا مقابلہ یونان اور روم اور وسطی زمانہ کے حیرت افزا لیکن ہنسی پیدا کرنے والے کاموں سے کرتے ہیں تب ہم شاید پہلی دفعہ خدا کی انگلی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور مسیح کے کاموں میں فطرت کے خدا کا مکاشفہ پاتے ہیں +

(۲) اور خاصکر یہ عجیب المخلوقات ایک تنہا واقعہ ہے جس کا نہ آغاز ہے نہ انتہا ہے اور نہ اس کا کچھ مقصد ہے۔ نہ کچھ اس سے مراد ہے نہ یہ کچھ معنی رکھتا ہے۔ نہ کسی سے کچھ رشتہ ہے۔ اور نہ قابل اعتبار ہے۔ پروفیسر ہیکسلے کی یہ بے تکی مثال ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ ہم خواہ اپنے لئے جانچ پرتال کریں۔ اور یہ اس امر کی بھی مثال ہے کہ بڑے بڑے علما بھی ایسے معاملات میں بعض اوقات سرسری تحقیقات پر قناعت کر لیتے ہیں۔ اناجیل کے معجزوں کا کرنے والا ایک لاثانی شخص تھا۔ یعنی ایسا شخص جس نے خدا کو منکشف کیا اور جہان کی توجہ خدا کی طرف پھیری۔ وہ معجزے اُس مکاشفہ کا جزو تھے۔ اور اُن کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں خدا کی نسبت یہ یقین پیدا ہوگیا کہ خدا رحیم اور مہربان ہے۔ اور یہ اس ظہور کا نتیجہ ہیں جس کی تیاری صدیوں سے ہو رہی تھی اور جن کا انتظار پشتوں سے چلا آتا تھا۔ ایسے معجزوں کا ہیکسلے کے عجیب المخلوقات سے مقابلہ کرنا کیسا بعید الفہم ہے۔ کہاں یہ عجیب المخلوقات اور کہاں وہ معجزے جو فوق العادت تاریخ کا جزو اور واقعات سے ایسے مطابق اور جس کا تعلق قدیم تاریخ سے پایا جائے +

الغرض یہاں آنکر وہ سارے اعتراضات ٹوٹ جاتے ہیں جو مسیحی معجزوں کے خلاف کئے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی مضبوط شہادت اُن کی تائید میں یہ ہے کہ وہ اس شخص کی سیرت کے مطابق ہیں جس سے وہ سرزد ہوئے۔ اور اس مکاشفہ کے مطابق جس کے تعلق میں وہ ظاہر ہوئے۔ اور

اس شہادت کو اکثروں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے متھیو آرنلڈ کا یونان اور روم کے شعبدوں سے مسیحی معجزوں کا مقابلہ کرنا ویسا ہی نامعقول ہے۔ جیسے ہیکسلے صاحب کا عجیب المخلوقات سے اُن کا مقابلہ کرنا۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ ہمیں یہ ماننا تو مشکل ہوگا کہ نیرو یا تراجان مردوں میں سے جی اُٹھا۔ لیکن جب کوئی ایسا عجیب شخص ہے کہ جو بیگناہی کے لحاظ سے بذات خود معجزہ ہے۔ جس کے جی اُٹھنے پر جہان کی اُمید کا انحصار ہے۔ تو میرے لئے ایسے شخص سے معجزوں کا صادر ہونا ناقابل اعتبار نہیں رہتا۔ کیا اس سے ہمارے خداوند کے معجزوں کی تائید نہیں ہوتی کہ وہ جہان میں ایک اعلیٰ مقصد کے پورا کرنے کو دکھائے گئے۔ اور کیا اس سے اسکا اعتبار دوبالا نہیں ہوجاتا کہ وہ بانعلق۔ بامعنی۔ مطابق اور ضروری تھے؟ یہ معجزے مسیح کے معجزے ہیں اس لئے وہ دوسرے معجزوں سے متفرق ہیں ❊

مختلف مذاہب کے معجزوں کا مقابلہ کرنے میں ہمیں اس امر پر قناعت نہ کرنا چاہئے کہ فلاں مذہب میں کثرت سے معجزوں کا ذکر آتا ہے۔ اور کہ مسیح کے معجزوں کا وہی پایہ ہے جو بیکٹ (Backet) بلکہ پاپ کے معجزوں کا ہے۔ بلکہ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ انمیں کیا کیا مشابہتیں اور کیا کیا فرق ہیں۔ اور خاصکر ہمیں ان معجزوں کے موقعے حقیقت اور اُن کے کرنیوالے کا لحاظ کرنا چاہئے اور اس سے اُن کے وقوع کا ظن غالب کم و بیش ظاہر ہوگا۔ ایسا لحاظ کرنے سے فوراً ہمکو معلوم ہو جائیگا کہ دیگر بانیان دین کے معجزوں سے مسیح کے معجزے بالکل متفرق اور دیگر قسم کے ہیں❊

اناجیل کے معجزوں پر یہ اعتراض بھی بعض لوگ کیا کرتے ہیں کہ بالفرض اگر وہ ثابت بھی ہوسکیں تو بھی وہ فضول اور بے سود ہیں۔ تعلیم معجزے کو ثابت کرتی ہے نہ کہ معجزہ تعلیم کو۔ چنانچہ ڈاکٹر راش ڈل صاحب (Dr Rashdall) کہتے ہیں "بذات خود یہ خیالات قیاسی نہیں کہ تاریخ عالم کے سارے دور میں معمولی طریقے سے ایک بھی مستثنیٰ نہ ہو لیکن اخلاقی طور پر یہ بالکل خلاف قیاس ہوگا کہ روحانی ضروری تاریخ ایک ایسے تاریخی واقعہ میں ایمان لانے پر موقوف ہو جو سلسلہ کائنات ایک مجرد مستثنیٰ ہو

متھیو آرنلڈ نے اس اعتراض کا یوں ذکر کیا ہے "البتہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے۔ بالفرض اگر میں یہ اعجاز دکھاؤں کہ میری قلم بدلکر قلمتراش بن جائے تو کیا اس سے میری تحریر زیادہ صادق ٹھیریگی یا زیادہ قائل کرنیوالی بن جائیگی۔ اگرچہ فی الحقیقت ایسا ہو بھی تو بھی عوام الناس کا کچھ اور خیال ہوگا۔ اگر میں آشکارا طور پر جس کا کوئی انکار نہ کرسکے قلم کو بدلکر قلمتراش بناد دوں تو عوام الناس کے نزدیک نہ صرف جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ کامل طور سے درست اور قابل یقین قرار دیا جائے گا۔ بلکہ عام تجربہ اور معمولی واقعہ کے خلاف باتوں کو بھی وہ مجھ سے منسوب کریں گے ٭

آرنلڈ صاحب کا ہر دوست یہ آرزو رکھیگا۔ کہ کاش اس جملہ کے لکھنے سے پیشتر اُسکی قلم بدلکر قلمتراش بن گئی ہوتی۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہے کہ اُس نے نئے عہدناموں کے معجزوں کی حقیقت اور مقصد کے بارہ میں غلطی کھائی۔ یہ کہنا عوام الناس کی ہتک کرنا ہے کہ اس ادنیٰ جیسے فعل سے جسکا ان باتوں سے کچھ تعلق نہیں وہ موثر ہونگے۔ ہم مسیح کے معجزوں کو اس لئے قبول کرتے ہیں کیونکہ ان میں وہی بات داخل ہے جسے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں معجزے۔ بے موقعہ۔ فضول اور بے تعلق اسناد ہیں بلکہ وہ بذات خود پر تعلیم اور کاشف ہیں۔ وہ اس قسم کے اسناد نہیں کہ انکو بزنال کرسکتے اور منظور کرسکتے اور پھر انکو بالائے طاق رکھکر جس غرض کیلئے وہ تھے اس غرض کی تحقیقات شروع کرتے۔ وہ اُس مہر کی مانند نہیں جو کسی خط پر لگائی جاتی ہے اور جسوقت ہم سربمہر خط کو لے لیتے ہیں۔ تو مہر کو توڑ پھینکتے ہیں تاکہ خط کے مضمون کو پڑھیں۔ بلکہ یہ معجزہ تو خط کے عین مضامین کا جزو ہیں۔ جو ہر سطر پر خط لکھنے والے کو منکشف کرنے اور اُسکی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ اس قیمتی عطیہ کی طرح ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ایک ہی شخص ایسا عطیہ بخشنے والا ہے۔ اور جب ہم یہ مانتے ہیں کہ ہمارے خداوند نے بیماروں کو شفا دی۔ قوائے فطرت پر اختیار ظاہر کیا اور مردوں میں سے جی اُٹھا۔ سب سے بڑا معجزہ اُس کی ذات سے پیوستہ تھا اور ہمیشہ کامل انسانیت خدا سے اور انسان سے کامل رشتہ اس نے ظاہر کیا۔ اسی امر نے اور نہ کسی بیرونی معجزے نے اُسکے پہلے شاگردوں کو اُسکی طرف کھینچا۔ کیونکہ مسیح کو دیکھکر اُنہوں نے خدا کو دیکھا اور روز بروز اپنے خیال سے کہیں بڑھکر اسکو افضل و اعلیٰ دیکھتے چلے گئے

اِس اعجاز سے بچنے کے لئے یسُوع کی بے گناہی کا اِنکار کرنا ایک افسوسناک حیلہ ہے۔ اُس کی بے گُناہی تو سارے معجزوں کا سرتاج تھی اور اُسی کے باعث دوسرے معجزوں کا اعتبار قائم ہوا۔ اِسی لاثانی معجزے کے ذریعہ وہ دوسرے اِنسانوں سے متفرق ہے اور یہی معجزے ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ وہ سارے انسانی تجربہ سے اعلیٰ اور اِنسانی قیاس ہو اندازہ سے کہیں افضل ہے۔ کیا روحانی جہان کا معجزہ طبعی جہان کے معجزے سے ادنےٰ ہوگا یا اعلےٰ۔ اِن میں سے کون علوی صفت ہے۔ پانی کو مَے بنانا یا کامل سیرت جس میں ناپاک خیال و خواہش کو بھی دخل نہ ہو؟ یہ تو لاثانی اور بیرون از قیاس ہے +

مسیح کی شخصیت ہی کے زور پر بعض مسیح کے معجزوں کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اُسکی یہ شخصیت بھی ان معجزوں کو لائقِ اعتبار ٹھہراتی ہے +

فہرست کتب
پنجاب رلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور

پاسٹر شی۔ جس میں چین کے ایک مسیحی پاسٹر کی زندگی کے سبق آموز حالات درج ہیں۔ نہایت مفید کتاب ہے۔ قیمت ۶ / +

معجزات مسیح۔ جس میں خداوند یسوع مسیح کے معجزات کی مفصل شرح و تفصیل درج ہے۔ اور نیز نصائح و مفید استنباطات جو اُن سے مستنبط ہوتے ہیں۔ یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے۔ قیمت عہ / مجلد عا / +

مقدمہ معجزات مسیح۔ جس میں معجزات کی حقیقت اور امکان و مقاصد پر ... مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور اعلےٰ ثبوت دئے گئے ہیں۔ درج ہیں۔ قیمت ۴ / +

گلدستہ وعظ۔ جس میں مسیحی مذہب کی مختلف باتوں کے متعلق نہایت جامع۔ مفید اور دلچسپ وعظ جو قابل دیسی اور انگریزی منادوں کے بنائے ہوئے ہیں درج کئے گئے ہیں۔ مسیحی منادوں کے لئے نہایت مفید کتاب تین حصے۔ قیمت ہر حصہ ۸ / +

مسیح کا نمونہ۔ ڈاکٹر سٹاکر صاحب کی مشہور کتاب جس میں ہر امر پر خداوند مسیح کی زندگی کی پیروی کے سبق درج ہیں۔ قیمت ۸ / +

مسیح کی پیروی۔ ٹامس اے کمپس کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ۔ قیمت ۸ / +

طیطس یعنی رفیق صلیب۔ خداوند یسوع مسیح کے حالات قصہ کے پیرایہ میں۔ قیمت ۶ / +

مسیحی مسافر کا احوال۔ بنین صاحب کی مشہور عالم کتاب یعنی خواب کے پیرایہ میں روحانی سفر کا قصہ۔ حصہ اول و دوم۔ قیمت ۱۲ / +

تاریخ بائیبل۔ مع حالات دیگر اقوام جن کا بائیبل میں ذکر ہے۔ ضخیم کتاب ہے۔ قیمت ۱۲ / +

فہرست کتب

مسیحی دین اور اخلاق۔ جس میں مسیحی تعلیم کی اخلاقی و رُوحانی حقیقت۔ الہیٰ شخصیت۔ کفارہ کی تعلیم۔ پاکیزہ بننے کا طریقہ۔ جن اُصول پر مسیحی تعلیم مبنی ہے۔ اِن کی تشریح۔ مشخص خدا کے بارے میں مشخص خدا کی شہادت ضمیر کی شہادت اخلاقی خدا کے بارے میں۔ مسئلہ ثالوث اخلاقی مکاشفہ ہے۔ اور نیز دیگر باتوں پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۸ر ❊

شہیدانِ کارتھیج۔ قدیم زمانے کے متعلق ایک تاریخی ناول قیمت ۱۲ر ❊

جنگِ مقدس۔ یہ بھی مسیحی مسافر کی طرح بنین صاحب کی مشہور دلچسپ کتاب ہے۔ سکولوں کے انعام کی فہرست اِن کتابوں کے بغیر مکمل نہیں ۴۰۰ صفحے سُف بورڈ۔ قیمت آٹھ آنے (۸ر) کپڑے کی جلد قیمت ایک

بھجن اور غزلیں جدید۔ ۴۸ صفحے۔ قیمت ۳ پائی ❊

حیات المسیح مسیح کی زندگی کے مفصل حالات مع مفید مطالب قیمت ۱۲ر

میزان الدین یا دھرم تُلا۔ پادری اُلمن صاحب کی تصنیف ہے۔ اِس میں ہندو اور مسیحی مذہبوں کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ساتویں دفعہ چھپی ہے۔ ۴۸ صفحہ قیمت ۳ پائی ❊

حقیقت المسیح۔ مصنفہ پادری۔ پی۔ کارنیگی سیمپسن صاحب۔ ایم۔ اے۔ و مترجمہ پادری طالب الدین صاحب بی۔ اے۔ قیمت ۸ر ❊

مکتب مسیح میں دُعا کی تعلیم۔ دُعا کے متعلق ہدایات از مرے صاحب قیمت ۱ر ❊

یادِ محبوب۔ صبح و شام کے لئے۔ میکڈف صاحب کی مشہور کتاب۔ قیمت ۴ر ❊

حیات داؤد۔ از پادری۔ ایف۔ بی۔ مائیر صاحب۔ نہایت دلچسپ روحانی کتاب ہے۔ جس میں حضرت داؤد کی زندگی سے مسیحی زندگی کی رہنمائی و ترقی کے لئے دلچسپ سبق نکالے ہیں۔ قیمت ۱۲ر ❊

ہم کس طرح لوگوں کو مسیح کے پاس لائیں۔ مترجمہ از ڈاکٹر ٹورڈی قیمت (۴ر) ❊

مسیح کے خاص دوست۔ از پادری۔ جے۔ آر۔ ملر صاحب۔ نہائت اعلیٰ درجہ کی رُوحانی کتاب ہے۔ جس میں مقربین حواریوں اور دیگر عورتوں کی زندگی کا حال دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ قیمت ۶ر ✤

مسیحی کا سفر۔ جان بنین صاحب کی مشہور عالم کتاب۔ یعنی خواب کے پیرایہ میں رُوحانی سفر کا قصہ۔ حصہ اوّل ۶ر سے ۱۲ر تک۔ حصہ اوّل و دوم مکمل ۱۲ر سے عہ ر تک ✤

طریق دُعا۔ میڈم گیون صاحبہ ایک مشہور فرنچ لیڈی کی کتاب سے ترجمہ ہُوئی۔ رُوحانی زندگی کے لئے نہائت مفید ہے۔ قیمت ۴ر ✤

مقدس آگستینوس کے اقرارات۔ قدیم زمانے کی مشہور رُوحانی کتاب ۱۲
[illegible] **اناجیل اربعہ**۔ مسیحی تجربہ اور اناجیل کی صحت کے تاریخی ثبوت قیمت ۱۲
[illegible] **مسیح کی گرفتاری اور موت**۔ تاریخی اور رُوحانی طور پر بحث کی ہے۔ قیمت ۱۲ر ✤

عیسیٰ کی سیرت۔ عادات وخصائل پر مفصل بحث کی ہے۔ قیمت ۱۰ر ✤

عہد جدید۔ نئے عہد نامہ کی کتابوں کا بیان جس کو پادری ایچ۔ جی۔ گرے اور پادری علی بخش نے تیار کیا۔ نئے عہد نامہ کے مطالعہ کے لئے ایسی کتاب نہایت مفید ہے۔ ۱۶۰ صفحے۔ قیمت آٹھ آنے (۸ر) ✤

حیاتِ پولوس۔ شاکر صاحب کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جو پادری علی بخش صاحب نے کیا۔ انگریزی میں یہ بہت مشہور کتاب ہے۔ اور اردو میں بھی کم مفید ثابت نہ ہوگی۔ ۱۱۲ صفحے۔ قیمت ۴ر ✤

خدا کی ہستی۔ مترجمہ پادری طالب الدین صاحب انگلستان اور امریکہ کے مشہور علماء کی تصنیفات سے تالیف کی گئی ہے۔ ۱۵۲ صفحے قیمت آٹھ آنے (۸ر) ✤

رُوحانی طاقت کے متعلق چند سنجیدہ خیالات۔ مترجم از ایس۔ ڈی گارڈن صاحب۔ ۱۶۸ صفحے۔ قیمت چار آنے (۴ر) ✤